عکسِ تحریر

عکسِ تحریر

تاریخ ادب اردو - جلد اول - اس میں شروع سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کی اردو ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے - اشاریہ
۷۱۲ صفحات بڑے سائز کے ہیں - تمہید بھی ہے اور اس سے پہلے "پیش لفظ" ہے جس میں اس جلد کا خاکہ اس طرح سے پہلے
کہ "ساری تصنیف کو، ترتیب زمانی سے، چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے - ہر فصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں مذکور ہو
ہر فصل کا پہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اس دور کی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی و لسانی اور
اجاگر کیا گیا ہے ... (پھر) اس دور کے ممتاز و نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے ذہن و اثرات اور ان کی تخلیقی کلی خصوصیات کو
تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے" - یعنی گویا اس طرح پہلی جلد کی ترتیب ہے - پھر تمہید سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے جیسا وشوں کا
سب سے پہلے اردو زبان اور اس کی نشو و نما کے اسباب اور حالات بیان کیے ہیں اور اس کے متعلق جو مختلف نظریے ہیں
ہیں ان پر تنقید کی ہے - زبان کس طرح شروع ہوئی اور کس طرح بڑھ کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی ؟ اس کے اسبابیات
اور تاریخی واقعات کیا ہیں ! ان سب کی تفصیل ہے اور تمہید کے آخر میں فرمایا ہے کہ "زبان کا مولد تو شمال ہے لیکن
تہذیبی تقاضوں کے تحت اس نے ادبی زبان کا درجہ، شمال سے صدیوں پہلے، گجرات و دکن میں حاصل کر لیا تھا" (صفحہ ۱)۔ اسی
پھر فصل اول شروع ہوتی ہے جس کے باب اول میں ۱۰۵۰ء سے ۱۵۲۵ء تک کے تاریخی واقعات کا اجمال ہے اور اس دور میں (۱)
مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی سے لے کر گرو نانک کے عہد تک جو الفاظ و اقوال ہماری زبان سے متعلق ملتے ہیں ان کا
ذکر ہے - دوسرے باب میں بابر سے شاہجہاں تک کے عہد کے اور تیسرے باب میں اورنگ زیب کے زمانے کے ایسے اقوال درج ہیں
اور لغت کے سلسلے میں صحیح فرمایا ہے کہ "کسی زبان میں لغت کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے جب وہ ارتقا کی
منازل طے کر کے ادبی اور علمی سطح پر استعمال کی جانے لگی ہو" (صفحہ ۷۸) -

۱۔ بعض صفحات سے متعلق معروضات ہیں :- (صفحہ ۷) بین الاقوامی ؟ (یا بر صغیر کی) زبان ؟
(صفحہ ۱۴، ۱۵ وغیرہ) بر عظیم (یا بر صغیر)
(صفحہ ۲۲) راشٹری کے ساتھ پانڑی بھی مشہور لفظ ہے جس میں سے گری نکالا گیا ہے -
(صفحہ ۲۳) محمد عوفی نے یہی بات دہرائی ہے - محمد عوفی تو امیر خسرو سے پہلے ہوئے ہیں وہ کیسے دہرائیں گے ؟
سبحان رائے تو اورنگ زیب کے زمانے کا ہے جس نے امیر خسرو کی "زبانِ پنجاب" کو زبانِ ہندوار کہا ہے -
(صفحہ ۲۶) تاج الدین کی مفتاح القلوب کا سالِ تصنیف ؟
(صفحہ ۲۹) فن لغت پر مثلثات قطرب سے پہلے خلیل ابن احمد کی کتاب العین لکھی گئی تھی جو چھپ گئی ہے -
(صفحہ ۳۱) محمد حسین آزاد نے خالق باری پر کوئی محققانہ نظر نہیں ڈالی اس لیے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں
(صفحہ ۳۱) وصالی کا سالِ وفات ؟
(صفحہ ۳۲) نہ سپہر کا شعر کچھ سہو کا شکار ہو گیا ہے -
(صفحہ ۳۳) "تحقیق سے معلوم ہوتا ہے" - کس کی تحقیق سے ؟
(صفحہ ۳۷) دوہا :- سائیں سیرت (سرت یعنی جسم) - اساکیری (سطر ۷) اساں کیری -
(صفحہ ۳۷) جمعات شاہی کا پورا حوالہ چاہیے - کب اور کس نے جمع کی ہے - چاہیے -

۲۔ صفحہ ۲۴ (سطر ۳) - لفظ کو توال، سنائی نے نہیں بلکہ فردوسی نے استعمال کیا ہے - حافظ محمود شیرانی نے اسے نقل کیا ہے : ع جو آگاہ شد کوتوال حصار
پہلی اور اس سے متعلق خالق باری بھی ہے - شیرانی مرحوم نے اسے ایک مؤخر خسرو کی تصنیف ثابت کیا تھا - ڈاکٹر جمیل جالبی اسے امیر خسرو ہی کی تصنیف
ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں اضافے اور تحریفات ہیں جن کی وجہ سے وہ امیر خسرو کی نہیں سمجھی گئی - اسی سلسلے میں مطبوعہ الحمیان کا ذکر بھی ہے
جو صفی کی ہے - اسی صفی کا ایک شعر باغ و بہار میں آیا ہے جس کے متعلق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اگر وہ کتاب امیر خسرو کی ہوتی تو وہ صفی کا شعر
کیوں لکھتے ؟ - اسی دور سے متعلق بابا فرید شکر گنج کا کلام بھی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے نقل کیا ہے - کچھ اور ادبی ملتے ہیں جو راقم الحروف کی کتاب
"فارسی پر اردو کا اثر" میں نقل ہوئے ہیں - صفحہ ۵۲ (سطر ۱۲) میں مصرع اس طرح ہوگا : الغفلت رحیب سیار درا ا
صفحہ ۷۹ میں خقہ ہندی کا ذکر ہے - شیرانی مرحوم نے اس کے ایک نسخے کے خاتمے پر "عبداللہ انصاری" لکھا ہوا دیکھا تھا - لیکن انصاری اضافہ
معلوم ہوتا ہے - عبداللہ عبدی صحیح ہوگا - تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب "تحریر و تقریر" (صفحہ ۱۶۹) ملاحظہ فرمائیں -

فصل دوم میں گجری ادب، اُس کی روایت، تاریخ اور نمونے دیے گئے ہیں۔ لیکن نمونے کم ہیں۔ تاہم "روایت" کا تعین بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ اور بالخصوص مجرّد الفاظ سے ایسے الفاظ کا اچھا ذخیرہ حاصل کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اردو زبان و ادب پر چھٹی صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی ہجری تک ہندوی روایت ہی کی حکمرانی رہی ہے" اور یہ "ہندوی روایت" مختلف علاقوں کی زبانوں سے مل کر علاقائی روایت بھی بن جاتی ہے جس کے تعین کی (صفحہ ۱۰۵) ڈاکٹر صاحب نے کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"گجری اردو کے اپنے مخصوص اوزان تھے۔ اُس کی پاس اپنی ہیئت تھی جس میں دوہرے، عقدہ، مکاشفہ اور چین شامل تھے۔ تصوف و اخلاق کے موضوعات کو موسیقی کی مختلف راگ راگنیوں کے مطابق، شاعری کی زبان میں ترتیب دینے کی روایت تھی" (صفحہ ۱۳۰) آپ خود اعتراف کرتے ہیں کہ "اگر اس دور کے گجری ادب کو دکنی ادب میں ملا دیا جائے تو ایک کو دوسرے سے شناخت کرنا مشکل ہوگا"۔ یہ بات دسویں صدی ہجری کے اواخر کے اثرات کے متعلق آپ نے لکھی ہے لیکن یہی بات زبان سے متعلق، اس سے پہلے کے دور میں بھی نظر آتی ہے۔ اس لیے لسانی ارتقاء سے متعلق یہ بات قطعی طور پر نہ کہی جا سکتی کہ دکنی زبان و ادب پر گجری اثرات ہی غالب ہوئے جب کہ خود دکنی زبان اس دور میں قریب قریب گجری ہی کی طرح تھی۔ (دیکھیں صفحہ ۱۵۵ - ۱۵۸) ع۱

دکنی زبان کے بہمنی دور کے موضوعات کی عمدہ اور صحیح تقسیم بھی کی گئی ہے کہ ایسے قصے منظوم کیے گئے ہیں جن سے نصیحت حاصل ہو، مذہبی جذبات کو آسودگی ملے اور تصوف و اخلاق کے موضوعات سے روحانی تسکین کا سامان مہیا ہو۔ اسی دور کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے جس میں راجہ کدم راؤ کی زندگی کے حیرت ناک اور دلچسپ واقعات کو نظم کیا گیا ہے ع۲

اسی زمانے کی (۱۰۲۳ھ / ۱۶۱۴ء) ایک تصنیف "بھوگ بل" کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۱۵۶) لکھا ہے کہ "اس کا مصنف قریشی پہلا شخص ہے جس نے اس زبان کو "دکھنی" کے نام سے پکارا ع۳ - پھر اس زمانے کی لسانی خصوصیات پر مفصل بحث آتی ہے۔

ع۱ صفحہ ۱۵۵ میں آپ نے لکھا بھی ہے کہ "گجری اردو اور اس دور کی زبان و بیان میں کوئی خاص فرق نہیں"۔

ع۲ غالباً ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے کہ کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) کے میرے ایک عزیز شاگرد نعیم الدین صاحب (جو بعد میں ڈاکٹر، پروفیسر اور پرنسپل بھی ہوئے) مجھے اپنے دولت کدے پر ایلچپور (برار) لے گئے۔ اُن کے یہاں ولی ویلوری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین[3] مثنویاں ملیں اور ایک قدیم تر مثنوی بھی ملی جو کدم راؤ پدم راؤ والی زبان میں تھی اور اس سے مقدم نہیں تو مؤخر بھی نہیں تھی۔ اس کے شروع کا ایک نام پنچھل داس تو یاد ہے، کچھ اور یاد نہیں۔ افسوس کہ یہ دونوں مخطوطے نعیم الدین صاحب سے ایک صاحب لے گئے، پھر اُن کا پتا نہ چل سکا۔

ع۳ نعیم الدین صاحب کے یہاں ولی ویلوری کی جو تین مثنویاں (روضۃ الشہداء، روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ) تھیں، اُن کے حاشیے پر ایک مثنوی پندنامہ بھی درج تھی جو ۱۰۰۰ھ کی تصنیف تھی اور ایک مثنوی اساس المصلیٰ بھی درج تھی جو اشتیاقی شاعر کی تھی۔ اُس کے آخر میں یہ اشعار تھے:۔

اساس المصلیٰ ہوا سب تمام — نبیؐ پر درود اں کہو والسلام
کیا اشتیاقی نے دکھنی اسے — سمجھ آئے گر ٹھیک یو پر کسے
سہنسر یو چوتھا اتھا سال جب — مرتب ہوا یو رسالہ سو تب

یعنی ۱۰۰۰ھ میں یہ مثنوی اشتیاقی نے مکمل کی تھی اور اس میں اسے "دکھنی" کہا ہے — حاشیے کی یہ دونوں مثنویاں بھی ولی ویلوری کے قلم سے لکھی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان مثنویوں کے مصنف ولی ویلوری کے بزرگوں میں سے رہے ہوں گے۔
ان سب مثنویوں کے متعلق راقم الحروف کا مضمون رسالہ معارف (اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۴۰ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

فصلِ سوم کے دوسرے باب میں نظامی سے اشرف تک شعراء کی زبان اور اس کے بیان پر بحث ہے۔ نظامی تو ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع ہے اور ماشاء اللہ اس پر خوب لکھا ہے۔ ابتداء میں معراج العاشقین پر بھی بحث ہے کہ وہ حضرت گیسو دراز کی تصنیف نہیں ہے بلکہ مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی ہے جیسا کہ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ثابت کیا ہے۔

فصل چہارم میں عادل شاہی دور کے ادب پر خصوصی بحث ہے اور صحیح تجزیہ کیا ہے کہ "گجری[1] ادب، اصل میں ہندوی روایت کی تجدید ہے، بہمنی دور کا ادب اسی روایت کی مزید تجدید و توسیع ہے اور (اسی طرح) بیجاپوری ادب بھی" (صفحہ ۱۸۷)۔ چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ "جب عادل شاہی سلطنت نے آنکھ کھولی تو بیجاپور میں گجری (ہندوی) روایت کے اثرات چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اسی روایت نے یہاں کے لکھنے والوں میں گجری کو معیارِ زبان و ادب کے طور پر قبول کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ یہی وہ بنیادی رجحان تھا جس نے بیجاپور کی زبان پر گہرا اثر ڈالا۔ اور اسی اثر نے بیجاپور کے رنگِ بیان اور اسلوب کو گولکنڈا کے اسلوب سے الگ کر دیا ---- اگر اردو زبان کا جدید اسلوب، فارسی اسلوب اور آہنگ سے نہ بنتا اور وہ بیجاپوری اسلوب کی روایت سے جنم لیتا تو آج بیجاپور کے شعراء کا کلام، بمقابلہ گولکنڈا کے شعراء کے، ہمارے لیے زبان آسان ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے دکنی کا سب سے بڑا شاعر نصرتی جلدی ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔"۔ ایسی بات بہت وسیع مطالعے کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے اور ڈاکٹر صاحب یقیناً داد کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد پھر عمدہ لسانی تجزیہ بھی ہے جس سے اس باب کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

پھر دوسرے باب میں گجری ادب اور ہندی روایت کے عروج پر بحث ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کی ہندوی اور فارسی روایت کی کشمکش کا ذکر ہے کہ فارسی اثرات تیزی سے غالب آ رہے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ میرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخص ہیں[2]۔ پھر میرزا مقیم کی مثنوی "فتح نامہ بکھیری" پر تفصیل سے بحث ہے اور مقیمی کی چندر بدن و مہیار کی عشقیہ مثنوی کی ہندوی اور فارسی روایتوں کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ "میرزا مقیم، مقیمی اور عاجز کی مثنویوں کے بعد زبان و بیان کا رخ مقرر ہو جاتا ہے اور بیجاپوری اسلوب اب شعوری [illegible] اسلوب سے وابستہ ہو جاتا ہے (صفحہ ۲۵۱)"۔ جانم[3]، ملک خوشنود، صنعتی، رستمی، اور حسن شوقی سب اس اسلوب سے قریب تر ہوتے گئے ہیں۔ اور انھوں نے فارسی کے تتبع کو عام کرنے کی کوشش کی ہے[4]۔ یہی خصوصیت مذہبی تصانیف کی بھی ہے جو فارسی اسلوب سے متاثر ہیں اور ماحول کی

۱- ڈاکٹر صاحب کو روایت کے متعین کرنے کا شوق بہت ہے۔

۲- اگر میرزا مقیم کی وفات ۱۰۷۵ھ اور ۱۰۸۰ھ کے درمیان ہوئی (مقدمہ چندر بدن و مہیار از اکبر الدین صدیقی، صفحہ ۱۹) تو ظاہر ہے کہ وہ اُس مقیمی سے مختلف تھا جس نے ۱۰۹۸ھ میں مثنوی چندر بدن و مہیار لکھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی کے دو شعر (صفحہ ۲۳۷) دیے ہیں:

تتبع غواصی کا باندھیا ہوں میں — سخن مختصر لیا کے ساندیا ہوں میں
عنایت جو اُس کی ہوئی مجھ اُپر — یو تب نظم قصہ کیا سر بسر

راقم الحروف کے پاس جو نسخہ اس مثنوی کا ہے اُس میں یہ دوسرا شعر نہیں ہے اور نیچے کے اشعار یہ ہیں:

تتبع غواصی کا باندھیا ہوں میں — سخن مختصر لیک ساندھیا ہوں میں
دلے میں الیس کوں سرایا نہیں — شعر میں کسی کا چورایا نہیں
سرانا چرانا منہا کام ہے — کریں تو عمل یو کر جو خام ہے
شعر کا تلازم گھر دار ہے — سنوارنا طبیعت کوں ناچار ہے

۳- اسی انداز کے قصے سید محمد والہ (م ۱۱۸۳ھ)، میر تقی میر اور مصحفی وغیرہ نے بھی نظم کیے ہیں۔ دیکھیں راقم الحروف کی کتاب علمی نقوش صفحہ ۱۹۱ ...

۴- صفحہ ۲۹۹ میں "کاتب الحروف شیخ داول" اور "کاتب الحروف فقیر الحقیر فتح محمد ابن شاہ داول" کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان دونوں باپ بیٹے کا پیشہ کتابت تھا یا شعور طلب ہے۔ شیخ داول پر محمد اکبر الدین صدیقی نے بھی قدیم اردو (حیدر آباد دکن ۱۹۶۵ء) میں لکھا ہے۔ اس میں غواصی کی مثنوی مینا ستونتی کی تفصیل ہے۔

پسند اور ناپسند کا اظہار کرتی ہیں۔ شیخ داول، خوش دہان اور امین الدین اعلیٰ کی تصانیف اپنے مذہبی رنگ کے باوجود ادبیت کا قدیم نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مخطوطات کا فاضلانہ طریقے سے جائزہ لیا ہے[1]، نیز قدیم ریختہ کی نشان دہی بھی کی ہے۔

اس بحث کے بعد "دکنی ادب" کے عروج کی داستان ہے۔ شاہی اور نصرتی پر تفصیل سے بحث ہے۔ لیکن اس دور کے لیے مزید شعراء بھی شامل کیے جا سکیں گے جن کا حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوے قدیم" میں ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس دور پر نصرتی کے اثرات کا ذکر اس طرح (صفحہ ۲۵۳) کیا ہے۔

"نصرتی نے اپنے دور کی شاعری پر دو گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلا اثر تو یہ تھا کہ اس نے زبان و بیان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جہاں تک دکنی شاعری اب تک نہیں پہنچی تھی۔ دوسرا اثر یہ تھا کہ اس نے ہیئت اور مواد کے گہرے رشتے کو واضح کیا اور اپنی شاعری میں ایک نئے فنی توازن کو قائم کیا"۔ یہ بات بالکل صحیح ہے، کیونکہ جو شاعر اس قدر اور اتنے عرصے تک ادب کی خدمت کرتا ہے وہ "عہد آفریں" ہو جاتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسے اسالیب مہیا کر جاتا ہے جن پر بہت سے ادبی ایوانوں کی اساس قائم ہو سکتی ہے۔ دیوانِ ہاشمی میں غزل کو امتیازی شان حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے اسباب و علل اور اس کے رنگ روپ پر عمدہ فاضلانہ بحث کی ہے۔ پھر ایاغی کی غزلوں اور مثنوی پر بحث ہے اور مرزا کے مراثی کا جائزہ بھی ہے۔

اس کے بعد فصلِ پنجم میں ڈاکٹر صاحب نے قطب شاہی دور کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے (صفحہ ۳۲۷) کہ "شمال اور جنوب کے ایک ہو جانے کے بعد "نئے ادب" کی کیا صورت بنی؟ اس کا کیا معیار قائم ہوا؟ ولی کب اور کیسے ظہور میں آیا؟ اس کا اصل کارنامہ کیا ہے؟" اس ذیل میں قطب شاہی دور کی مختصر تاریخ، پھر گولکنڈا اور بیجاپور کے ادب کے نمونے، فارسی الاصل کا آغاز، اس کا رواج، اس کا عروج، توسیع، تکرار اور آخر میں دکنی روایت کا خاتمہ وغیرہ عنوانات ہیں جن کے تحت مختلف شواہد کے ساتھ دکنی روایت کے اختتام اور فارسی روایت کے آغاز کا ذکر ہے۔ فارسی روایت کے عروج کے سلسلے میں وجہی کا نام سب سے پہلے آیا ہے، کیونکہ اس نے فارسی اسالیب کو نظم و نثر دونوں میں اختیار کیا ہے[2]۔

پھر وجہی کی تصانیف کا ذکر ہے اور ڈاکٹر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ تاج الحقائق، وجہی کی تصنیف نہیں ہے[3]۔ وجہی کی قطب مشتری اور سب رس پر تفصیل سے بحث ہے اور ان دونوں کتابوں کی اہمیت کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور آگے چل کر مجموعی طور پر محمد علی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے درباروں کی ادبی خدمات کا اجمالی ذکر بھی ہے[4]۔

ع[1] صفحہ ۳۰۶ کا یہ جملہ حاشیے میں ہوتا تو بہتر تھا: "۱۱۵۰ھ میں شاہ ولی اللہ قادری نے اس رسالے کا اردو میں ترجمہ کیا"۔ صفحہ ۳۰۸ میں ڈاکٹر صاحب نے خوش دہان کے متعلق لکھا ہے کہ "فکری سطح پر وہ جانم کی لکیر کے فقیر ہیں ۔۔۔"۔ یہ بات صحیح بھی ہے لیکن ایسا بھی ہے کہ خوش دہان نے "ذکرِ خفی" (صفحہ ۳۰۷-۳۰۸) پر زور دیا ہے اور جانم نے (صفحہ ۲۰۳-۲۰۴) ذکرِ خفی سے زیادہ ذکرِ جلی پر زور دیا ہے۔

ع[2] ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۳۳۴ کے حاشیے میں وجہی کا ایک فارسی شعر نقل کیا ہے۔

اسمم اسداللہ و وجیہہ است تخلص — آرائش ہر کانچہ بازار کلام است

غالباً دوسرا مصرع اس طرح ہوگا: — آرائش دکانچۂ بازار کلام است

ع[3] ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۳۴۴) لکھا ہے کہ تاج الحقائق کے مصنف کی بات کو "خدا کی بات" کہا گیا ہے، لیکن جو عبارت دی گئی ہے اس میں اُن کی بات کو "خدا کی بات میں سند" کہا گیا ہے۔

ع[4] برہانِ قاطع بھی اسی عہد کی فرہنگ ہے۔ (اس کے ہم نام اور ہم عصر محمد حسین تبریزی المتخلص معلوم ہے) راقم الحروف کا مضمون اورینٹل کالج میگزین (ستمبر، دسمبر ۱۹۷۵ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے ولی کے نام اور سنین پر بحث کی ہے۔ ولی کے نام کے متعلق تو اس کا صرف یہ شعر کافی ہو سکتا ہے:۔

بعدِ شاہِ نجف، ولی اللہ — پیرِ کامل علی رضا پایا [ع۱]

یعنی اے ولی اللہ، شاہِ نجف یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد (اُن کے سلسلے میں) مجھے پیرِ کامل شیخ علی رضا [ع۲] (م ۱۱۴۳ھ) ملے ہیں — یہ شیخ علی رضا، شیخ فرخ شاہؒ (م ۱۱۱۸ھ) کے صاحبزادے تھے اور شیخ فرخ شاہؒ حضرت خواجہ محمد سعیدؒ ابن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے صاحبزادے تھے۔ روضۃ القیومیہ (۱/۲۹۵ بعد) میں شیخ علی رضاؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ علوم سیمیا، کیمیا، ریمیا وغیرہ اور نغمہ و سماع سے بھی (اپنے اسلافِ کرام کے خلاف) تعلق رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ پھر اپنے والد صاحبؒ سے رجوع ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے ولی کے سنین کے لیے فراقی کی مثنوی مرآۃ الحشر کے آخر کے قطعۂ تاریخ کو بنیاد بنایا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ:۔

کیا قصدِ تاریخ جب بولنا — یو اجمال، تفصیل کے کھولنا

تو مجھ دل کیا اس وزا انتخاب — یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب (۱۱۳۳ھ) [ع۳]

ڈاکٹر صاحب نے آخری مصرع کے تمام الفاظ کے اعداد جوڑ کر ۱۱۳۳ھ بنایا ہے اور پھر (صفحہ ۵۳۷) لکھا ہے کہ "اس مثنوی میں فراقی نے جن مرحوم شعراء کا ذکر کیا ہے اُن میں نصرتی اور حسن شوقی تو شامل ہیں۔ لیکن ولی کا ذکر نہیں"۔ یعنی ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ولی اس مثنوی کی تحریر کے وقت (۱۱۳۳ھ) زندہ تھے اور جن لوگوں نے اُن کی وفات ۱۱۱۹ھ میں متعین کی ہے وہ صحیح نہیں ہے — ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ولی کے مرشد علی رضاؒ کا انتقال ۱۱۴۳ھ میں ہوا، شاہ گلشنؒ کا ۱۱۴۰ھ میں اور نورالدین صدیقی سہروردیؒ کا ۱۱۵۵ھ میں ہوا تو ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ میں قرینِ قیاس نہیں ہے — بہرحال، شواہد کی کم یابی یا نایابی کی وجہ سے ہم نہ تو ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کو آسانی سے رد کر سکتے کہ مذکورۂ بالا قطعۂ تاریخ کے آخری مصرع کے تمام الفاظ کو جوڑ کر ۱۱۳۳ھ صحیح سمجھا جائے اور نہ ہم اُس قطعۂ تاریخ کو نظر انداز کر سکتے جو ولی کے قلمی دیوان (جامع مسجد بمبئی) کے آخر میں درج ہے اور جس سے ۱۱۱۹ھ برآمد ہوتا ہے [ع۴]

پھر ولی کا دہلی جانا یا نہ جانا بھی متعین کرنا مشکل ہوگا، حالانکہ کئی فضلا نے لکھا ہے کہ ولی دہلی گئے تھے [ع۵]۔

ع۱ پہلے مصرع کے پہلے لفظ کو بعض حضرات نے "بادشاہ" پڑھا ہے۔ یعنی ع بادشاہِ نجف ولی اللہ — لیکن اس طرح پڑھنے سے اس کا ربط دوسرے مصرع سے صحیح نہیں رہتا۔

ع۲ مرآۃِ احمدی (صفحہ ۱۲۴) میں ان کی تاریخ وفات یکم ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ درج ہے۔

ع۳ ڈاکٹر صاحب نے انجمن ترقی اردو کے مخطوطے کا حوالہ دیا ہے جو بے شک ناقص الاول اور ناقص الآخر ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اردو مخطوطات (جلد دوم۔ صفحہ ۸۲) میں اس تصنیف کا سال ۱۱۰۰ھ لکھا ہے۔

ع۴ مولانا افسر نے (مخطوطات۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۲۸۱) میں فراقی کی جو غزل درج کی ہے وہ زبان کے لحاظ سے اس فراقی کی مثنوی کی زبان سے بہت متقدم معلوم ہوتی ہے۔ پھر اگر اس مثنوی کو ۱۱۳۳ھ کی تصنیف سمجھا جائے کہ جس میں شاعر نے لکھا ہے کہ میری ساری عمر فارسی میں صرف ہوئی تو گویا اُس نے اس سال سے پہلے دکنی اردو میں بہت کم (یا بالکل نہیں) لکھا تھا، تو پھر ایسی حالت میں وہ ولی (جس کی وفات ڈاکٹر صاحب نے ۱۱۳۳ھ اور ۱۱۳۸ھ کے درمیان متعین کرنے کی کوشش کی ہے) کیونکر اس شاعر کے مصرع پر گرہ لگاتا!

ع۵ حکیم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم (صفحہ ۱۰۴) میں لکھا ہے کہ ولی نے فقیر اللہ آزاد کی غزل پر غزل لکھی تھی اور آزاد، فراقی کے ساتھ دہلی گئے تھے — ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطات (چہارم۔ صفحہ ۲۷۲) میں لکھا ہے کہ "فراقی نے آزاد اور ولی کے ساتھ اورنگ آباد سے نکل کر سورت، احمد آباد اور دلی تک کا سفر کیا تھا" — خود ڈاکٹر صاحب نے بھی لکھا ہے کہ ولی دہلی گئے تھے (صفحہ ۵۶۰)۔

ڈاکٹر صاحب نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانے کے دوسرے شعراء کا ذکر بھی کیا ہے جن کے بارے میں پہلے پوری طرح تحقیق نہیں تھی مثلاً قطب زاری[1]، قطبی، ابن نشاطی، سید بلاقی[2]، عبداللطیف بھدروی وغیرہ کے حالات اور تصانیف سے متعلق بہت مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں — اور ان کے ساتھ ہی ابن نشاطی کی مثنوی "پھولبن"[3] کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ اس دور میں "عشق" ہی مختلف تصانیف کا موضوع تھا اور اسی روایت نے ولی کی غزل کے لیے گنجائش پیدا کی تاہم یہ ضرور ہے کہ اس دور میں دین اور تصوف بھی ادب پر غالب تھا جو "عشق" ہی کی ایک منزل ہے — عبداللطیف، معظم، غواصی وغیرہ کی نظم اور میراں جی خدانما، میراں یعقوب وغیرہ کی نثر بھی اسی سلسلۂ روایت کی کڑیاں ہیں —

ڈاکٹر صاحب نے "فارسی روایت کا تکرار" (صفحہ ۵۰۶) کے ذیل میں بہت خوب لکھا ہے کہ "زوال پذیر معاشرے میں فرد صرف اپنی ذات کو مرکز بنا کر زندگی کا سفر طے کرنے لگتا ہے۔ تنگ نظری، مفاد پرستی، علاقائی تعصبات اور ملک فروشی، حکمراں قوتیں بن جاتی ہیں ۔۔۔ یہی صورت حال ابوالحسن تانا شاہ کے دورِ حکومت میں نظر آتی ہے۔ دیواریں گر رہی ہیں اور تخلیقی قوتیں بجھ گئی ہیں" — بے شک اس دور میں وجہی یا غواصی جیسا شاعر نہیں ہوا لیکن ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۵۰۷) اعتراف کیا ہے کہ "ادب کی طویل روایت اور شمال کے گہرے اثرات کی وجہ سے زبان و بیان میں صفائی و روانی پیدا ہوگئی ہے اور زبان و بیان کے نئے معیار کے خدوخال صاف نظر آ رہے ہیں اور یہ خصوصیت خود ابوالحسن تانا شاہ کے کلام میں بھی ملتی ہے ۔۔۔" — پھر ڈاکٹر صاحب نے طبعی کی مثنوی "بہرام و گل اندام" کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "اگر امین و دولت اور ملک خوشنود کی مثنویوں سے طبعی کی مثنوی کا مقابلہ کیا جائے تو زبان و بیان، فن اور ترتیب قصہ کے اعتبار سے یہ زیادہ پختہ معلوم ہوتی ہے" — یعنی اس دور میں مثنوی نے بھی ترقی کر لی ہے، کیونکہ وہ اب فارسی کی تقلید میں لکھی جانے لگی تھی — پھر مختار، فتاحی، شغلی، خفیفی، خواصی، سیوک، قدرتی، فائز، اولیا[4] وغیرہ کے کلام کا جائزہ ہے اور دکنی ادب کے خاتمے کے اسباب بھی بیان کیے ہیں اور حسین ذوقی، قاضی محمود بحری کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں — ڈاکٹر صاحب نے ریختہ کی روایت کی مقبولیت کا آغاز متعین کیا ہے —

فصل ششم میں "فارسی روایت کا نیا عروج" مذکور ہے جس میں ولی پیش پیش ہیں — ڈاکٹر صاحب نے یہی لکھا ہے کہ "ولی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمال کی زبان کو دکنی ادب کی طویل روایت سے ملا کر ایک کر دیا اور ساتھ ساتھ فارسی ادب کی رچاوٹ سے اس میں اتنی رنگا رنگ آوازیں شامل کر دیں اور امکانات کو اتنی وسعت بھی ابھار دی کہ آئندہ دو سو سال تک اردو شاعری انہی امکانات کے ستاروں سے روشنی حاصل کرتی رہی" (صفحہ ۵۲۹)

---

[1] صفحہ ۴۸۶ میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ رازی نہیں، زاری صحیح ہے — لیکن کوئی ثبوت پیش نہیں کیا — یہ بھی لکھا ہے کہ قطبی دوسرا شاعر ہے جو بے شک ہوگا — لیکن اس قطب کو حکیم شمس الدین قادری نے اردوئے قدیم (صفحہ ۶۸) میں اس شعر کی بنا پر قطبی بھی کہا ہے:

نازش جہاں میں مری کیتا، کیتا سرا کے جو بھی — قطبی دھریا امید یوں لایا ہوں سب صاحب نظر

اس شاعر پر راقم الحروف نے بھی ناگپور یونیورسٹی جرنل (نمبر ۱۹۶۲ – ۱۹۶۳ء) میں لکھا تھا —

[2] سید بلاقی کے معراج نامہ پر عزیزی پروفیسر نصیرالدین نے بھی ناگپور یونیورسٹی جرنل میں بحث کی تھی — مجھے اب اس کی تاریخ یاد نہیں رہی —

[3] ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ پھولبن ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی ہوگی — حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب (صفحہ ۶۹) میں انڈیا آفس والے نسخہ کا سنہ ۱۰۶۶ھ ہی لکھا ہے اور کتب خانۂ آصفیہ والے نسخہ کا ۱۰۷۶ھ بھی لکھا ہے — ممکن ہے کہ موخرالذکر نسخہ نظرِ ثانی کے بعد تیار ہوا ہو —

[4] اولیا کی مثنوی میں "قصۂ ابوشحمہ" بیان کیا گیا ہے — یہ قصہ جس قدر مشہور کیا گیا ہے اسی قدر تحقیق سے دور ہے —

پھر ڈاکٹر صاحب نے ولی کے معاصرین اور متاخرین کا جائزہ لیا ہے۔ سراج، فراقی[۳] داؤد، اور قاسم کی شاعری پر بحث ہے اور اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "لیکن اب جمیل جالبی، آخر کس کس کا ذکر کرو گے؟" (صفحہ ۵۸۵) پھر "اختتامیہ" میں بولی، زبان اور ادب کی مختلف منزلوں کی شناخت کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ولی نے اردو زبان و ادب کے ارتقاء کو جدید دائرے میں داخل کر دیا اور فارسی روایت کو ایک نیا عروج دے کر اسے اردو زبان و ادب کا مقدر بنا دیا۔۔۔" (صفحہ ۵۹۰) گویا اس جلد کا اختتامیہ ولی کی خدمات پر مہر ثبت کرتا ہے اور اس کے بعد پاکستان کے مختلف علاقوں کی اردو خدمات پر ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔

"پنجاب میں اردو" والا ضمیمہ سب سے پہلے ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے، کیونکہ "اردو شاعری کی روایت کے مطالعے سے، جو ناتھ پنتھیوں کے کلام اور پھر چھٹی صدی ہجری سے آج تک مسلسل سرزمینِ پنجاب پر جاری و ساری ہے، یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ زبان، جسے مسلمانوں نے یہیں سے اٹھایا، سینے سے لگایا اور اپنی فتوحات کے ساتھ سارے برِعظیم میں پھیلا دیا، ایک ایسی زبان تھی جو یہاں مختلف علاقائی زبانوں کے درمیان ایک بین العلاقائی زبان کی حیثیت سے شروع ہی سے موجود اور رائج تھی۔ اسی لیے آج تک پنجابی اور اردو ایک ہی زبان کے دو روپ نظر آتے ہیں" (صفحہ ۶۶۹) — ڈاکٹر صاحب نے اس حصے میں مسعود سعد سلمان، بابا فرید شکر گنج[رح]، گرو نانک، شاہ حسین، مولانا عبدی، حاجی محمد نوشہ، شیخ عثمان جالندھری[علیہ الرحمہ]، افضل جھنجھانوی، ناصر علی، شاہ مراد[۲]، جعفر زٹلی، فاضل الدین بٹالوی، بلھے شاہ[رح]، وارث شاہ[رح]، مراد شاہ وغیرہ کے کلام کا دوسرے علاقوں کے کلام سے تقابلی مطالعہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ "وہ سامراجی قوتیں جو پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں کر رہی ہیں اور اسی لیے مختلف الزبان آبادیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے اور اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش میں ہیں، اُن کا بنیادی منصوبہ یہی ہے کہ اسلام اور اردو کو، جو آج تک جوڑنے اور متحد رکھنے کا کام کر رہے ہیں، کھرچ کر کمزور اور بے اثر کر دیا جائے" (صفحہ ۶۷۹)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "سندھ میں اردو" والا ضمیمہ شامل کیا ہے۔ اور اس ضمیمے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے سندھ کے مختلف شعراء اور ادباء کے کلام سے اردو کلام کا مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ اردو کیونکر مشترک زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور آخر میں علامہ آئی آئی قاضی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اردو بین الاقوامیت، بین الاقوامی قومیت کی علامت ہے۔ یہ زبان دنیا کی تین عظیم تہذیبوں یعنی ہند آریائی، سامی اور منگول تہذیبوں کا سنگم ہے۔ یہ زبان سارے ایشیا کی لنگوا فرینکا بننے کے لیے موزوں ہے" — پھر ڈاکٹر صاحب نے اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبانوں کے "لسانی اشتراک" پر عمدہ بحث کی ہے۔ آخر میں "بلوچستان کی اردو روایت" کا جائزہ لیا ہے اور بلوچستان کے بہت سے الفاظ کا ذکر کیا ہے جو اردو میں جذب ہو گئے ہیں اور اس طرح یہ ۷۱۲ صفحات کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے۔

۱۔ شیخ عثمان جالندھری کئی بزرگوں سے بیعت ہوئے، پھر حضرت مجدد الف ثانی[رح] (م ۱۰۳۴ھ) کے شیخ سے بیعت ہوئے۔ اُن کے مکتوبات "اللہ والے کی قومی دکان، لاہور" سے شائع ہوئے تھے۔ اُن کے متعلق راقم الحروف کا مضمون رسالہ الرحیم (حیدر آباد۔ نومبر ۱۹۶۷ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت خواجہ محمد معصوم[رح] ابن حضرت مجدد الف ثانی[رح] نے بھی اردو کے کئی الفاظ اپنے فارسی مکتوبات میں استعمال کیے ہیں۔

۲۔ ولی کے ایک دوست بھی محمد مراد بیگ تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "مقصودِ دل ہے اُس کا خیال اے ولی مجھے
جو مجھ زباں کا ورد محمد مراد ہے"

یہی محمد مراد، غالباً خواجہ عبدالاحد وحدت[رح] (م ۱۱۲۶ھ) المعروف "شاہ گل" کے مکتوبات کے جامع تھے۔ دیکھیں "گلشنِ وحدت" (مرتبہ راقم الحروف و مولانا عبداللہ جان۔ کراچی ۱۹۶۶ء) جس میں گل، گلشن اور عندلیب وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔

تاریخ ادبِ اردو کی دوسری جلد اٹھارھویں صدی[1] کے سیاسی پس منظر، پیش منظر، طرزِ فکر اور تہذیبی و معاشرتی حالات کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے بعد ملک میں ابتری پھیل گئی اور "ناخوب" کو "خوب" سمجھا جانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ "پچاس سال کے عرصے میں نااہل جانشینوں کی بے طاقتی، خانہ جنگی، عیش پرست امراء کی باہمی آمیزش، عسکری قوت کی کمزوری اور سلطنت کے وسیع تر مفاد میں اتحاد کے جذبے کے فقدان نے اس وسیع و عریض سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا (صفحہ ۱)۔ ان حالات کے لیے ڈاکٹر صاحب نے تمام ضروری تاریخیں اور تذکرے کھنگال ڈالے ہیں اور بہت سی معاشی اور معاشرتی خامیوں کی نشان دہی کی ہے[2] اور آخر میں لکھا ہے کہ "اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اردو زبان، نہ صرف فارسی کی جگہ لے لیتی ہے، بلکہ ادبی زبان بن کر برِعظیم[3] کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔ اردو زبان کی فتح دراصل برِعظیم کے عوام کی فتح تھی جس میں ہر مذہب و عقیدہ کے لوگ شریک تھے" (صفحہ ۱۶)۔ لیکن فارسی زبان و ادب کی روایات اور مختلف اثرات برابر قائم رہے اور اب تک ہیں اور یہی چیزیں اردو ادب کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ثابت ہوئی ہیں۔ عروض، اصنافِ سخن، مصطلحات، صنائع و بدائع، اخلاص و اخلاق کے مضامین، شاعرانہ مزاج و مذاق، حسن و عشق کے تصورات اور اُن کے اظہار کے لیے بنیادی الفاظ، محاورات، تلمیحات، خیالات اور بکثرت تراکیب بھی اردو میں فارسی سے اور فارسی کے ذریعے عربی سے بھی ماخوذ ہیں۔

تمہید کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فصلِ اول شروع کی ہے اور سترھویں صدی کے دکنی ادب کا پس منظر بیان کیا ہے کہ فتحِ بیجاپور (۱۶۸۶ء) اور فتحِ گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) کے بعد دکن اور شمال کے تہذیبی اور لسانی تعلقات قریب تر ہوئے، بہت سے شعراء ایسے ہیں کہ ان کی زبان میں زیادہ فرق باقی نہیں رہا۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد یہ اکائی ٹوٹ گئی۔ "جب یہ صورتِ حال ہوتی ہے تو نثر سے طویل جملے اور شاعری سے طویل نظمیں غائب ہونے لگتی ہیں" (صفحہ ۴۴)۔ لیکن پھر اسی صفحے پر ڈاکٹر صاحب نے سیاسی انتشار اور معاشرتی بدحالی کے نتیجے میں بھی طویل نظموں کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔ میلاد نامے، معراج نامے، پند نامے، شہادت نامے، وفات نامے اور جنگ نامے "رسمی مذہبی جذبات کو آسودہ کرنے کے لیے لکھے جانے لگے" بلکہ "اس پُر آشوب دور کا ہر فرد تلاشِ سکون میں ایک طرف تصوف[4] کی چھتری کے نیچے آ کھڑا ہوا اور دوسری طرف مذہبی رسوم کی ادائگی کو اپنی خواہشات کے پورا ہونے کا وسیلہ سمجھنے لگا" (صفحہ ۴۴)۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب بہت سے رسم و رواج پہلے ہی (صفحہ ۱۰ تا ۱۵) بیان کر چکے ہیں اور کچھ یہاں بھی بیان کرتے ہیں اور مذہبی رسوم و عقائد سے متعلق مختلف نظموں اور مرثیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ روشن علی روشن سارنگ پوری[5] کی مثنوی عاشور نامہ اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں عوام کی زبان، عوام کے لب و لہجہ میں ہے، گو کہ اس میں فارسی فعل و حرف بھی ہیں۔

۱ـ گیارہ سے اٹھارہ تک "ھ" چاہیے۔ اس لیے "اٹھارویں" کے بجائے "اٹھارھویں" بہتر ہوگا۔
۲ـ اس دور سے اور سادات بارہہ سے متعلق ایک ضروری ماخذ روضۃ القیومیہ ہے جس میں معاصرانہ واقعات ملتے ہیں۔
۳ـ یہاں اور ہر جگہ ڈاکٹر صاحب نے برِعظیم (برِصغیر کو) لکھا ہے۔
۴ـ پُر آشوب زمانے میں اردو کو فروغ ہوا۔ بادشاہوں نے اسے منہ لگایا، فارسی تراکیب و محاورات اردو میں منتقل ہونے۔ یہ سب تفصیل تمہید کے دوسرے باب میں ہے۔ لیکن صحیح تصوف وہ نہیں ہے جو عوام اختیار کر لیتے ہیں، وہ صرف "تزکیۂ نفس" ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا لازمی جزو ہے۔ دیکھیں سورۃ البقرہ (۱۵۱)، آل عمران (۱۶۴)، الجمعہ (۲) وغیرہ۔
۵ـ حضرت مجددِ الفِ ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے زمانے میں سارنگ پور، صوفیہ کا مرکز تھا۔ مولانا باقر اور مولانا عبد الباقی وہیں کے تھے۔

اس طرح روشن علی روشن اور اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں پر مفصل بحث کرکے ڈاکٹر صاحب نے دکنی اردو اور شمالی اردو کا فرق متعین کیا ہے (صفحہ ۶۶-۶۷) — دوسرے باب میں جنگ نامۂ عالم علی خان اور وقائع (رزم ناموں) کی تفصیل ہے اور اُن کی تاریخی اہمیت بھی بتائی ہے۔ تیسرا باب جعفر زٹلی سے متعلق ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے محمود شیرانی مرحوم سے دو جگہ اختلاف کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ جعفر "میر" نہیں تھے "میرزا" تھے (صفحہ ۱۲) — دوسرے یہ کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور جعفر کی ولادت ایک ہی سال میں نہیں ہوئی (صفحہ ۹۲) — پہلی بات کے متعلق فرمایا ہے کہ کلیات میں ایک نظم "کدخدائی میرزا جعفر" (صفحہ ۹۱) ہے (گوکہ کوئی شعر نہیں دیا کہ جس میں لفظ میرزا ہو) اور دوسری بات کے متعلق فرمایا ہے کہ جعفر نے میاں دانش کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر اُس کی ایک ہجو لکھی تھی اور اُسے تو شاہ جہان کے دربار میں ۱۰۶۵ھ میں ایک قصیدہ پیش کرنے پر انعام بھی ملا تھا (صفحہ ۹۲)۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی (سنہ ۱۰۶۸ھ) کے سال میں جعفر کی ولادت کس طرح متعین ہو سکتی ہے!۔

پھر ڈاکٹر محی الدین زور کی ایک تحقیق کی بھی تصحیح کی ہے کہ جعفر کا انتقال سنہ ۱۱۰۶ھ میں نہیں بلکہ سنہ ۱۱۲۵ھ میں ہوا ہے، (صفحہ ۹۴)۔ کیونکہ اُس نے ۱۱۱۳ھ میں ۱۱۱۸ھ میں تاریخی قطعات لکھے تھے اور بہادر شاہ (سنہ ۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۴ھ) کی بادشاہی کے زمانے کی کیفیت بھی لکھی ہے (صفحہ ۹۳)۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "جعفر کا دور پُر آشوب تھا۔ ایک بڑی تہذیب سنبھالا لے رہی تھی۔ جعفر زٹلی، طنز و ہجو کے ذریعے اُس کی مسخ روح کو آئینہ دکھاتا ہے اور دوسری طرف ایہام گو شعراء اسی جشن فنا میں شریک ہو کر اس کی ترجمانی کرتے ہیں — زٹل اور ایہام گوئی ہی اس دور کے ترجمان بن سکتے تھے اور یہی ہوا" (صفحہ ۱۱۶) ع۲

فصل دوم میں ڈاکٹر صاحب نے فارسی کے ریختہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے اور بہت حسین "تمہید" کے ساتھ کیا ہے کہ:
"موسم بدلتا ہے تو بہت پہلے سے جانے والے موسم اور آنے والے موسم میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ آنکھ مچولی اتنی آہستہ رو ہوتی ہے کہ نئے موسم کی خبر ہمیں اُس وقت ہوتی ہے جب وہ واقعی آچکتا ہے۔ یہی صورت روایت کے ساتھ ہے جو موسم کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے اور معاشرے کو اس تبدیلی کی خبر اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اُسے قبول کر چکتا ہے" (صفحہ ۱۲۱) — روایت کی تبدیلی کو قبول کرنے والے یا معاشرے کو اس تبدیلی کی خبر کرانے والے شعراء میں عبد الغنی قبول، شاہ وحدت (شاہ گل)، شاہ گلشن، بیدل، امید، انجام، پیام،

ع۱ ڈاکٹر صاحب نے بھی دو جگہ صفحہ ۱۱۲ (سطر ۱۶) اور صفحہ ۱۱۵ (آخری سطر) میں میر جعفر ہی لکھا ہے۔

ع۲ جعفر زٹلی کی ایک مستقل تصنیف "جنگ نامہ" کی نشان دہی ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے اپنے مضمون "تین نثری نوادر" (نقوش سالنامہ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء) میں کی ہے۔

ع۳ راقم الحروف نے جشن نامہ (اورینٹل کالج میگزین لاہور سنہ ۱۹۷۲ء) کے لیے ایک مضمون "کلام بیدل کی تاریخی تعیین" عرض کیا تھا — اس میں تفصیل ہے کہ بیدل نے سنہ ۱۰۷۵ھ میں بہار سے دہلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں ۶ ارجب سنہ ۱۰۷۶ھ کو شاہ جہان کے انتقال پر تاریخ لکھی — پھر بہت سے واقعات پر تاریخیں کہیں — فرخ سیر (م سنہ ۱۱۳۱ھ) شاہ گلشن سے بیعت ہو گیا تھا — بیدل نے فرخ سیر کی مدح بھی لکھی ہے — سفینۂ خوشگو کے دفتر ثالث میں شاہ گلشن کے فارسی کلام (غزل و رباعی) کے نمونے محفوظ ہیں اور شاہ گلشن سے منسوب کر گئے —

آرزو، مخلص، بہار، آزاد بلگرامی وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان میں سے کئی شعراء کے حالات بھی دیئے ہیں اور کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ شیخ سعداللہ گلشن کے حالات تحقیق سے لکھے ہیں کہ وہ شاہ گل[1] کے مرید اور بیدل کے شاگرد تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے ولی کو وہ غزل بھی دی تھی (دیوان ولی۔ صفحہ ۱۳۸۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو) جو نمونے کے لیے تھی اور یہ کہ انھوں نے اپنے مرشد کے نام کی مناسبت سے گلشن تخلص اختیار کیا تھا (صفحہ ۱۲۸) پھر یہ بھی لکھا ہے کہ بقول بندرابن داس خوشگو کے، "۲۲ سال احمد آباد، گجرات، اورنگ آباد اور دوسرے بلادِ دکن میں گھومتے۔ اس کے بعد بیس سال دہلی میں رہے" (صفحہ ۱۳۰)۔ خوشگو، شاہ گلشن کے شاگرد تھے اور انھوں نے ۱۱۴۰ھ اُن کا سالِ وفات لکھا ہے۔ یعنی ۱۱۲۰ھ سے ۱۱۴۰ھ تک دہلی میں رہ کر وہیں فوت ہوئے اور اس سے پہلے وہ ۲۲ سال باہر رہے اور ۲۲ سال سے پہلے بھی وہ دہلی ہی میں تھے اور بقول سرخوش کے، ۷-۸ سال اُن کی (سرخوش کی) شاگردی میں رہے تھے۔ اور "آخر میں میرزا بیدل کی صحبت اختیار کی"۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے پیام[2] اکبرآبادی، قزلباش خان امید اور امیر خان انجام کے حالات کی تحقیق کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انجام "ریختی" کے موجد تھے گو کہ اُن کے اس صنف کے اشعار اب دستیاب نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس فصل کے باب دوم میں فارسی کے ریختہ گو شعراء یعنی سراج الدین علی خان آرزو[3]، آنند رام مخلص، لالہ ٹیک چند بہار، نواب درگاہ قلی خاں درگاہ اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات اور کلام کا ذکر کیا ہے مع تفصیل و تحقیق کے ساتھ ان پر بحث کی ہے۔ (آرزو کے سلسلے میں) ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "سراج الدین علی خان آرزو نے اردو میں تقریباً ۲۰ شعر کہے ہیں۔ اشعار کی یہ تعداد ہرگز ایسی نہیں کہ اُن کے حوالے سے اُن کو تاریخِ ادب میں کوئی جگہ دی جائے۔ لیکن اس دور کی ایک پُراثر علمی و ادبی شخصیت کی حیثیت سے اُنھوں نے ایسے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ ریختہ نے فارسی کی جگہ لے لی ہے۔۔۔ (صفحہ ۱۴۸)۔ لیکن راقم الحروف اتنا اضافہ ضرور کرے گا کہ فنِ لغت پر جس انداز سے انھوں نے علمی خدمات انجام دی ہیں انھیں اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے خود بھی صفحات ۱۰۱ تا ۱۶۰ میں اس کا اعتراف کیا ہے اور قدرت اللہ قاسم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اُن کا رتبۂ والا، ریختہ سے بالاتر ہے۔۔۔" (صفحہ ۱۶۰)۔

---

[1]۔ تذکرہ نشترِ عشق میں ہے کہ بیدل کی تجویز پر شاہ گلشن نے اپنا تخلص (گلشن) اختیار کیا تھا۔ شاہ گل کے مکتوبات "گلشنِ وحدت" کے نام میں بھی یہی مناسبت نظر آتی ہے۔ ان مکتوبات کے جامع شیخ محمد مراد کشمیری تھے اور ممکن ہے کہ ولی نے انھی کے متعلق کہا ہو:۔ مقصودِ دل ہے اُس کا خیال اے ولی مجھے جو جگ زباں کا ورد محمد مراد ہے
ولی کے ایک شعر میں (عمداً نہ سہی) وحدت اور گل کی رعایت بھی ہے:

وحدت کے گلستاں کا چمن جُسن ہو تیرا — پھولا ہے نین بیچ بہارِ گل و نرگس

بہرحال، شاعری کا سلسلہ اس طرح بن جاتا ہے کہ شاہ گل کے شاگرد شاہ گلشن اور شاہ گلشن کے شاگرد عندلیب (اور ولی بھی) اور اُن کے صاحبزادے خواجہ میر درد اور میر اثر۔

[2]۔ پیام کا نام شرف الدین علی خان تھا۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (لاہور ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۳۱) میں بھی اسی نام اور تخلص کا ایک شاعر مذکور ہے جو مصحفی کا شاگرد تھا۔ تذکرہ میں یہ شعر بھی دیا ہے:

ہائے اُس دیوانے دل نے کام ہی ایسا کیا — آپ تو بدنام تھا اور مجھ کو بھی رسوا کیا

[3]۔ سراج الدین علی خان آرزو کی "چراغِ ہدایت"، غیاث اللغات کے حاشیے پر بھی نول کشور نے ۱۸۸۰ء میں شائع کی تھی اور خود صاحبِ غیاث اللغات نے اس سے استفادہ کرنے کا اعتراف مقدمے میں کیا ہے۔

اس دور میں فارسی شاعری کی علامات اور اشارات کا استعمال اردو میں عام ہوگیا تھا اور درگاہ قلی خان کی "مرقع دہلی" سے نہ صرف محمد شاہی دور کی معاشرتی حالت کی تفصیل معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اس دور میں ریختہ کا رواج عام ہوگیا تھا۔ منقبت کہنے میں جاوید خان، مرثیہ گوئی میں مسکین، حزین اور غمگین شہرت رکھتے تھے، محمد نعیم ریختہ میں ایسی شاعری کرتا تھا کہ جیسے فارسیاں، فارسی نہیں کرتے تھے۔ محفلوں میں فارسی اور ریختہ کے اشعار ساتھ ساتھ پڑھے جاتے تھے" (صفحہ ۱۷۱)۔ تاہم یہ دور فارسی اور عربی ہی کا تھا اور عربی میں حسان الہند آزاد بلگرامی تو برصغیر کے سب سے زیادہ مستند علماء میں شمار ہوتے تھے۔

فصل سوم، ولی کے اثرات سے شروع ہوتی ہے اور ایہام گوئی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کی توجیہ ڈاکٹر صاحب نے اس طرح کی ہے کہ "(اس دور میں) ہر شخص ... اپنے کھوکھلے پن کو چھپانے کے لیے ظاہری نمائش پر زور دے رہا تھا۔ اس کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف تھا۔ ثنویت کا تضاد، فرد کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ (اس طرح) سارے معاشرے کو ہر چیز اور ہر بات کے دو رُخ اور دو معنی نظر آ رہے تھے" (صفحہ ۱۹۰)۔ ایہام گوئی کو داغ دار بنانے کے کچھ اور عوامل بھی تھے (صفحہ ۱۹۶، ۲۰۱)۔ ڈاکٹر صاحب نے فارسی شعراء کی روایات کی (صفحہ ۱۹۶) اور صوفیہ کے "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" (صفحہ ۲۰۱) کی جس طرح توجیہ کی ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اتنی حقیقت ضرور ہے کہ معاشرے کے ازہان بدلتے ہیں اور چھوٹے بڑے سب کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اور گو کہ ایسے دور میں "کوئی چراغ دہلیؒ، کوئی گیسو درازؒ یا کوئی نظام الدین اولیاءؒ نظر نہیں آتا" (صفحہ ۲۰۱)۔ تاہم یہی دور اصلاح حال کا دور بھی ہے، کیونکہ اسی دور میں پے در پے شاہ عبدالرحیمؒ (م ۱۱۳۱ھ)، اُن کے صاحبزادے شاہ ولی اللہؒ (م ۱۱۷۶ھ)، حضرت مظہر جانِ جاناںؒ (م ۱۱۹۵ھ) اور شاہ فخر دہلویؒ (م ۱۱۹۹ھ) جیسے علماء اور صوفیہ دہلی ہی میں پیدا ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے پھر شمالی ہند کے صاحبِ دیوان شعراء کی اولیت پر بحث کی ہے اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کے اس قول کو صحیح نہیں سمجھا کہ فائز ایسے شاعروں میں سب سے مقدم ہیں (صفحہ ۲۰۳)۔ ڈاکٹر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ "شمالی ہند کے ریختہ گو شعراء میں آبرو پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں جنھوں نے ولی کے انداز پر (فائز کی طرح) اپنا دیوانِ ریختہ مرتب کیا" (صفحہ ۲۰۷)۔ اسی لیے اس فصل کے دوسرے باب میں آبرو ہی کی شاعری پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شروع میں اُن کے حالات کی تحقیق کی ہے، پھر سعادت خان ناصر کے حوالے سے آبرو اور حضرت مظہر کے مکابرہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت مظہر نے اُن کی مذمت میں ایک شعر کہا تھا۔ یہ واقعہ اور ایسے دوسرے واقعات جو محمد حسین آزاد نے بھی مختلف پاکیزہ نفوس کے متعلق تراشے ہیں تاریخ کی روشنی میں غلط معلوم ہوتے ہیں۔ آبرو ۱۰۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۴۶ھ میں فوت ہوئے۔ دہلی میں اُن کی آمد کی تاریخ اور وہاں کے قیام کی صحیح مدت متعین نہیں۔ فرض کر لیا جائے کہ وہ ۲۵-۳۰ سال کی عمر میں دہلی آ گئے تھے یعنی (۱۱۲۰ھ یا ۱۱۲۵ھ) تو اُس وقت حضرت مظہرؒ کی عمر ۱۰-۱۵ سال کی ہوگی۔ حضرت مظہرؒ نے اپنے فارسی دیوان کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "در سالِ شانزدہ از عمر بر روے این خاکسار غبارِ یتیمی نشست و در بیست، مشتِ خاکِ خود را بداماں درویشاں بست، مدتِ سی سال بر درِ مدرسہ و خانقاہ جاروب کشید و ایامِ گزیدۂ عمر درین شغلِ شریف گزرانید بحول اللہ وقوتہ در طولِ مدتِ زندگی، دستِ طلب بلوثِ دنیا نیالود و پاے سعی درین راہ نفرسود۔ امروز کہ ہزار و صد و ہفتاد ہجری ست و عمر بشصت رسیدہ از بیست سال بکنجِ عزلت آرمیدہ است ..."

یعنی بیس سال کی عمر سے قریب تیس سال تک آپ نے "مدرسہ و خانقاہ" میں اپنی عمر گزاری، اور قریب ۱۱۵۱ھ میں
گوشہ نشینی اختیار کی — ڈاکٹر صاحب نے بھی صفحہ ۳۶۱ تا ۳۶۴ اُن کے فضائل و خواصل کا ذکر کیا ہے — تو پھر
ان جیسے پاکیزہ نفس نے زبان کے آبرو کے لیے ویسا شعر ادا ہونا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ عـ۱
ڈاکٹر صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ "ایہام گوئی عـ۲ چونکہ نئے رویوں اور ذہنی تبدیلیوں کا ساتھ دینے سے قاصر تھی، اس لیے
چند سال کے اندر اندر اس کا اثر زائل ہوگیا اور اس کی جگہ نئی شاعری نے لے لی۔ اس نئے رجحان کے پہلے
ترجمان مرزا مظہر جانِ جاناں تھے جو ایک طرف فارسی و اردو کے شاعر تھے اور دوسری طرف روحانی سطح پر
اس دور میں رشد و ہدایت کا مرکز تھے" (صفحہ ۳۴۸) — اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب
"فارسی شاعری کے سارے اسالیب، اصناف اور ہیئت، اردو شاعری کے لیے قابلِ قبول ہوگئے اور ایک
پختہ کار زبان کی شاعری اور اس کے تمام موضوعات — تصوف، وارداتِ عشق، اخلاقیات، خمریات،
رندی و درویشی، حیات و کائنات کے مسائل بھی اس کے تصرف میں آگئے — فارسی آہنگ و لہجہ، اس کی
لحن و لے، استعارات و تشبیہات کا رنگ و مزاج، رمزیات و ضمنیات، علامات و تلمیحات،
بندش و تراکیب، اردو شاعری کے خون میں شامل ہوگئے" (صفحہ ۳۵۱) — پھر آپ نے "ردِّ عمل" والے
شعراء کی زبان و بیان کا پس منظر بیان کرکے ایسے شعراء کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور اس
فصل کے دوسرے باب میں حضرت مظہر اور اُن کے شاگردوں کی لسانی اور ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ
لیا ہے — اور بتایا ہے کہ غیر ایہام عـ۳ والے شعراء سے ان کا درجہ کس قدر بلند ہے — اور انھوں نے کس طرح ایک ایسے
کلچر کی تعمیر کی ہے جس میں عربی، ایرانی اور ہندی کلچر مل کر ایک وحدت بن گئے ہیں (صفحہ ۳۵۵)
حضرت مظہر کے شاگردوں میں یقین پہلے "جوان" شاعر ہیں جنھوں نے ایہام گویوں سے ہٹ کر صاف اور
پاکیزہ ریختہ کہا اور دوسروں نے اُن کی پیروی کی (صفحہ ۳۷۲) — یقین حضرت شاہ گل (سید احمد
وحدت سرہندی مجددی) کے پوتے تھے، اسی لیے حضرت مظہر کو بہت عزیز تھے اور اُن کے فن کمال کے
متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ شاہ حاتم جیسے اُستاد نے اُن کی زمین میں غزلیں لکھی تھیں (پہلی غزل ۱۱۵۲ھ میں
کہی تھی) —
یقین کے دیوان میں اُن کے تخلص کے ابجدی اعداد کے مطابق ۱۷۰ غزلیں ہیں اور ان میں صرف تیرہ بحریں استعمال ہوئی ہیں

عـ۱ کلیاتِ طیبات (طبع مراد آباد ۱۸۹۶ء) کے صفحات ۱۶۶ - ۱۶۷ میں بھی شاہ ولی اللہؒ نے بہت احترام اور دلسوزی کے ساتھ
حضرت مظہرؒ کو یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے (۳۵۹) حضرت مرزا مظہرؒ کے نام و تخلص کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی کا بیان نقل کیا ہے
بھگوان داس ہندی نے سفینۂ ہندی (۱۲۱۹ھ) میں اسی سے ملتا جلتا واقعہ دوسری طرح نقل کیا ہے۔ اور حضرت مظہر کے بعض شاگردوں کا
ذکر بھی کیا ہے یعنی، حسین بیگ اظہر (صفحہ ۱۹)، محمد فقیہ دردمند (صفحہ ۷۷)، سنگھ لعل عزت (صفحہ ۱۳۸)، شیخ غلام علی راسخ (صفحہ ۲۱۱)
راقم الحروف کی کتاب "لوائح خانقاہ مظہریہ" بھی ملاحظہ ہو۔
عـ۲ ڈاکٹر صاحب نے ایہام گو شعراء کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے — آبرو کے علاوہ ناجی، مضمون، یک رنگ، احسن، اشتیاق،
سعادت علی امروہوی، یک رو، سجاد وغیرہ پر بھی بحث ہے اور ان کے حالات کا تحقیقی جائزہ بھی لیا ہے — یہاں یہ عرض کرنا
بے محل نہ ہوگا کہ شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے عرصہ ہوا دیوانِ سجاد مرتب کرکے شائع کیا تھا۔
عـ۳ ایسے شعراء کا ذکر فصل سوم کے چوتھے باب میں ہے — اشرف، فائز، رضی، مبتلا، مراد، صابر، عزلت کا ذکر
بڑی تحقیق کے ساتھ ہے اور ان کے متعلق بہت سی نئی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ان غزلوں کا تجزیہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "یقین نے اپنے مختصر دیوان میں فارسی شاعری کے بنیادی علائم و رموز، تلمیحات و اشارات، بندش و تراکیب، بحور و اوزان اور خوبصورت زمینیں استعمال کر کے اردو شاعری کا رشتہ ایک بار پھر براہِ راست فارسی شاعری کی روایت سے قائم کر دیا ۔۔۔ (صفحہ ۴۷۸)"۔ عبدالحی تاباں، میر محمد باقر حزیں، محمد فقیہ دردمند، اشرف علی فغاں، احسن الدین بیان، سب اسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اور "ردِ عمل تحریک" کے ایک بہت اہم شاعر شاہ حاتم ہیں "جنھوں نے اپنی طویل زندگی میں تین دَور دیکھے اور اردو شاعری کو اپنی صلاحیتوں سے ایک ایسی صورت عطا کی جسے نئی نسل کے شعراء نے خود حاتم کی زندگی میں نئے رنگ بھر کر مکمل کر دیا" (صفحہ ۵۱۵)۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب نے اسی فصل کا تیسرا باب شاہ حاتم ہی سے متعلق باندھا ہے۔ ان کے حالات، ان کے کلام کی تعیین، نظم و نثر میں ان کی انفرادیت اور ان کی مجموعی خدمات کو تفصیل اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فصل پنجم کا پہلا باب میر و سودا سے شروع ہوتا ہے اور یہ زمانہ وہ ہے جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہر طرح کی تباہی اور بربادی کی یادگار ہے۔ لیکن یہی زمانہ وہ ہے جب کہ اردو شاعری میں "جذبات و واردات" کا رجحان تیز ہوا (صفحہ ۵۷۰) اور بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، ہجو، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت وغیرہ اصنافِ سخن رواج پذیر ہوئے اور "فارسی کے مسندِ اقتدار سے ہٹتے ہی اردو شاعروں کو بھی وہی مقام مل گیا اور دربارِ سرکار، امراء و نوابین کی ویسی ہی سرپرستی حاصل ہو گئی جیسی اب تک صرف فارسی گویوں کو حاصل تھی" (صفحہ ۵۹۱)۔ اصنافِ سخن کے علاوہ شعراء کے تذکرے بھی اسی دور میں بہت زیادہ لکھے گئے اور خود زبان و بیان میں تیزی سے تبدیلیاں ہوئیں۔

فصل پنجم کے دوسرے باب میں میر تقی میر کا حال تفصیل سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ میر ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے (۱۱۳۷ھ میں نہیں)۔ یہ بھی لکھا ہے کہ میر نے خانِ آرزو سے کسبِ فیض کیا، انھی کے مشورے پر ریختہ گوئی شروع کی، بیماری (جنون) کے دوران شاعری کا آغاز ہوا اور بیماری کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۱۲۵ھ سے ۱۱۶۰ھ تک وہ آرزو کے پاس رہے، پھر رعایت خاں کے متوسل ہو گئے (صفحہ ۵۰۹)۔ اسی کے ساتھ (صفحہ ۵۱۹ تک) میر کے دوسرے حالات تحقیق کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ پھر ان کے معاصرانہ معرکوں کا ذکر ہے۔ غرور و نخوت، احساسِ برتری، درد و غم وغیرہ سب میر کے مزاج و مذاق میں داخل تھے۔ خدا جانے تسلیم و رضا کا جذبہ (صفحہ ۵۲۵) ان کی فطرت میں ودیعت تھا یا مجبوراً اختیار کیا گیا، نکات الشعراء اور ان کے واقعات سے اس جذبے کی تائید شاید مشکل سے ہو سکے[1]۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس کی مدد سے ہم میر کے مزاج، کردار، شخصیت، اندازِ فکر، معیارِ شاعری، تنازعات اور معرکوں وغیرہ سے واقف ہوتے ہیں" (صفحہ ۵۳۳)۔ لیکن فن کے لحاظ سے یہ تذکرہ معیاری نہیں ہے (صفحہ ۵۳۳)۔ تاہم اس کے محاسن بھی بیان کیے گئے ہیں اور اس کے مطالعے سے میر کے نظریۂ شعر کی وضاحت بھی کی گئی ہے (صفحہ ۵۳۸)۔ پھر فیضِ میر اور ذکرِ میر کتابوں کی تفصیل بھی دی گئی ہے اور میر کے کلام کے مختلف مجموعوں کا ذکر بھی ہے اور اسی جائزے پر یہ باب ختم ہوتا ہے[2]۔

۱۔ میر کی خوردہ گیری، طرف داری، احساسِ برتری، بلکہ غلط بیانی وغیرہ کا ذکر بھی صفحات ۵۳۰ تا ۵۳۱، ۵۴۶ وغیرہ میں ملتا ہے۔

۲۔ صفحہ ۵۵۲ میں فارسی مصرعے غالباً اس طرح رہے ہوں گے:—

ع ہر کسے روے بسوی تو دارد

ع غلط کردم کہ رشتہ بگشود از خود

اور صفحہ ۵۵۵ میں چشم رکھنا (چشم داشتن = امید رکھنا) میں ایہام ہے۔

فصل پنجم کے تیسرے باب میں میرؔ کی شاعری (بالخصوص غزل) پر تفصیل سے بحث ہوئی ہے اور کئی مقامات پر بہت خوب تبصرہ کیا ہے۔ ایک جگہ اس طرح تجزیہ کیا ہے:-

"میرؔ کے کلیات کو پڑھتے وقت ہمیں طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ ہمیں غم زدہ کر دیتا ہے، کبھی وہ ہمارے غموں کا تزکیہ کر دیتا ہے، کبھی وہ ایسی سچائی کا شعور ہمیں دیتا ہے جس سے شاید ہم واقف تو تھے۔ لیکن اس طرح نہیں جس طرح میرؔ نے ہمیں واقف کرایا ہے۔ کبھی ہم اس سے اُکتا جاتے ہیں لیکن ان سب کیفیات کے ساتھ میرؔ کے شعر ہمارے ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر ہمیں بدلتے رہتے ہیں اور جب کلیات ختم ہو جاتا ہے تو ہم سیکڑوں اشعار نہ صرف منتخب کر چکے ہیں بلکہ احساس و جذبہ کی دنیا میں ہل چل مچا کر وہ ہمارے گونگے جذبوں کو زبان بھی دے دیتے ہیں اور ہم خود کو پہلے سے زیادہ باشعور اور زندہ انسان محسوس کرنے لگتے ہیں" (صفحہ ۵۷۳)

ایک اور جگہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:-

"میرؔ ہمیں رُلاتے نہیں ہیں بلکہ غم کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ غم کے حُسن اور حُسنِ بیان سے ہم خود غم کو بھول جاتے ہیں جیسے کسی بدنما چیز کی خوبصورت تصویر دیکھ کر ہم اُس کی بدنمائی کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ میرؔ کے غم کا اثر ایک کامیاب ٹریجیڈی کا سا ہوتا ہے۔ جیسے ٹریجیڈی میں ہم زندگی کے المیے کو پہلے تو شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن جب ہم رونے کے قریب پہنچتے ہیں تو فن کا توازن، طرزِ حُسن اور اُس کا راگ آہنگ ہمیں اس غم انگیز المناک کیفیت سے بچا لیتا ہے" (صفحہ ۵۸۵)۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے غم اور غنا کے رشتوں پر بحث کی ہے اور اُن انسانی رشتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو میرؔ کی شاعری کی "تجربہ گاہ" ہیں (صفحہ ۵۸۹)۔ اُن کی انا پرستی، بددماغی، کم آمیزی اور بے نیازی بھی اُن کی شاعری کے عوامل تھے اور ایک بات یہ بھی تھی کہ "جب وہ اپنے تخلص کے ساتھ خود کو مخاطب کرتے ہیں تو اُن کا تخلص، زندگی کا استعارہ بن جاتا ہے" (صفحہ ۵۹۱)۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "میرؔ کی شاعری میں قدرتی مناظر اُن کے جذبے کا حصہ بن کر آتے ہیں" (صفحہ ۵۹۲) سہلِ ممتنع، محاورات کا استعمال، اردو آمیز تراکیب، طویل بحور، ایجاز و اختصار، موسیقیت آمیز توازن وغیرہ بھی میرؔ کی شاعری کے خدوخال ہیں۔ گویا مجموعی محاسن کی وجہ سے "میرؔ دنیا کے اُن شاعروں میں سے ایک ہیں جو ہر ملک اور ہر ادب میں عظیم سمجھے جاتے ہیں" (صفحہ ۶۰۳)۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے میرؔ کی زبان اور مختلف اصنافِ سخن پر بھی بحث کی ہے اور اپنی اس جلد کے حصۂ اوّل کو ختم کر کے دوسرے حصّے کے مطالعے کی دعوت دی ہے۔

جلد دوم کے دوسرے حصّے کا آغاز فصل پنجم کے چوتھے باب سے ہوتا ہے جو سودا سے متعلق ہے۔ سودا کے حالات سے متعلق بھی ڈاکٹر صاحب نے تحقیق فرمائی ہے۔ مختلف تذکروں کے اقوال کو پرکھنے کی کوشش کی ہے اور سودا کے مختلف مقامات کے قیام کے سنین متعین کیے ہیں[۱]۔ سودا نے فارسی میں خانِ آرزو سے اور اردو میں شاہ حاتم سے مشورہ کیا تھا (صفحہ ۶۵۵) بلکہ خانِ آرزو ہی کی تجویز پر انھوں نے اردو میں شاعری شروع کی تھی (صفحہ ۶۵)۔ بہت سے اور واقعات بھی لکھے ہیں۔ مثلاً:

میر نے جب نکات الشعراء (۱۱۶۵ھ) مکمل کیا تو سودا کو یقین کے مقابلے میں کمتر قرار دے کے یہ بھی لکھ دیا کہ انھیں ملک الشعراء کہنا چاہیے اور قائم جو سودا کے شاگرد تھے یہ بھی لکھتے ہیں کہ "نامدار بادشاہوں کی قبولیت اور عالی مرتبت سلاطین کا تقرب اسے (سودا کو) حاصل ہوا اور بالفعل ملک الشعراء کے خطاب کا، جو شاعروں کا بلند درجہ ہے، اعزاز و امتیاز رکھتا ہے" (صفحہ ۶۵۵)

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر اور سودا دونوں خانِ آرزو کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، پھر بھی میر نے اپنے دیوان اول میں اُن کو جاہل کہہ دیا اور سودا نے اس سخت کلامی کا جواب صرف یہ دیا کہ:

ع وہ ان طرزوں سے کیا واقف، وہ میر انداز کیا سمجھے! (صفحہ ۶۶)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سودا کے دوسرے واقعات لکھے ہیں۔ اُن کی ذہانت، قادر الکلامی، علمیت اور صلاحیت سب کچھ مسلّم ہے۔ ایسے باکمال شعراء کم ہوتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں اُن کی تصانیف موجود ہیں اور غالباً اُن کی کوئی تصنیف غیر مطبوعہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پھر میر اور سودا کے چار قریب المعنی اشعار لکھ کر اُن کا موازنہ اور مقابلہ کیا ہے۔ مزاج اور مذاق دونوں شاعروں کا مختلف ہے اس لیے ان میں فرق پایا جانا بھی لازمی ہے۔ پھر سودا کے وہ اشعار بھی پیش کیے ہیں جو لکھنؤ کے دبستان کے زیادہ قریب ہیں (صفحہ ۶۸) اور جو ناسخ کے دور کے معلوم ہوتے ہیں۔

غزل کے علاوہ قصیدہ سودا کا شاہکار ہے۔ اس صنف[۲] میں غالباً اردو کا کوئی شاعر اُن کے پایے کا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سودا کی زبان و بیان پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے اور صحیح فرمایا ہے کہ "وہ ہمیں ایک پیدائشی شاعر نظر آتے ہیں جنھیں شعر گوئی کا بے پناہ ملکہ ودیعت ہوا تھا۔ اُن کے لیے شعر کہنا سانس لینے اور بات کرنے کا مترادف تھا" (صفحہ ۷۰)۔

فصل پنجم کا پانچواں باب خواجہ میر درد سے متعلق ہے۔ اس باب میں بھی تحقیق کے ساتھ درد کے حالات درج ہیں۔ اُن کی مختلف تصانیف کے شواہد سے اُن کے سنین بھی متعین کیے ہیں۔ اور ان کے سماع[۳] کا

۱۔ بالاپور (برار) کی خانقاہ نقشبندیہ میں سودا کے کلیات کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔ مجھے اب اُن کا سال کتابت یاد نہیں لیکن ایسا خیال ہے کہ وہ دونوں نسخے ۱۱۹۵ھ کے لگ بھگ تیار ہوئے تھے۔ مومن کے شاگرد آسی نے مطبع مصطفائی سے ۱۲۷۰ھ میں کلیات سودا شائع کیا تھا۔ لیکن ان کی تصحیح کے باوجود اس کی تصحیح کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

۲۔ راقم الحروف کا ایک حقیر سا مضمون "سودا کے قصیدے" (ادبی جائزے) مادح اور ممدوحین دونوں کے متعلق مفید ہو سکتا ہے۔

۳۔ سماع کے متعلق ایک غلط فہمی عام ہے کہ مزامیر اس کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ بغیر مزامیر کے حمد و نعت اور عشقِ الٰہی سے متعلق اشعار ایک پاکیزہ شخص سے سننا ہر سلسلے میں جائز ہے۔ البتہ اس فعل کو بھی لازم نہیں سمجھنا چاہیے مزامیر جائز ہے۔ حضرت بہاء الدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "نہ این کار می کنیم و نہ انکار می کنیم"۔ دیکھیے مکتوب ۲۹۲ (مکاتیب خواجہ باقی باللہ)

ذکر بھی ہے۔ درد کے اوصاف میں قدرت اللہ شوق کا یہ قول ہی کافی ہے کہ "ترک، تجرید و استغنا میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا" (صفحہ ۷۲۸)۔ اور "استقلال اُن کے مزاج میں ایسا تھا کہ دلی کے اُجڑنے پر جب عزّت دار بے عزّت ہو گئے اور اہلِ کمال ایک ایک کر کے دلی چھوڑ کر باہر جانے لگے، وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور ساری تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے ۔۔۔ زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا۔ جو وقت بچتا وہ تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا جس کا اندازہ اُن کی تصانیف کی تعداد اور حجم کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے" (صفحہ ۷۳۰)۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے درد کے "طریق محمدی" کی تفصیل دی ہے اور اُن کے "وطن در سفر" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "برِ عظیم کی تاریخ التصوف میں درد کو مفکر صوفیہ کی اُس صف میں شامل کرنا چاہیے جس میں داتا گنج بخشؒ، خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، امیر الدین اعلیؒ اور مجدد الف ثانیؒ وغیرہ کھڑے ہیں" (صفحہ ۷۴۱)۔ اس موضوع پر زیادہ کچھ عرض کرنے کے بجائے خود ڈاکٹر صاحب ہی کا قول نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "وہ لوگ جو تصوف پر فراریت کا الزام لگاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ تصوف نے ہمیشہ دورِ زوال میں مقبولیت حاصل کی ہے اور اس کے ثبوت میں زوالِ بغداد اور زوالِ دہلی کی مثال پیش کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ اس دور میں تصوف ہی نے انسان کے زخموں پر مرہم رکھ کر اُسے نیا حوصلہ دیا اور اس کی زندگی میں نئے معنی اور نیا مقصد پیدا کر کے اُسے اس زوال کی مٹا دینے والی پستی سے بچا لیا" (صفحہ ۷۴۱)ع۱ پھر ڈاکٹر صاحب نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ "شاعری، درد کے لیے ایک قسم کی عبادت ہے۔ وہ شاعری اسی طرح کرتے ہیں جیسے مذہبی عبادت کو انہماک و خلوصِ دل سے ادا کرتے ہیں" (صفحہ ۷۴۵)۔ یہاں اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ کام جو اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے عبادت میں شمار ہوتا ہے، درد بھی غالباً اسی نیت سے شاعری کرتے ہوں گے۔

درد نے بے شک وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مسئلے پر یہ شعر مکمل ہے:

متفق آپس میں ہیں اہلِ شہود — درد آنکھیں دیکھو باہم ایک ہیں

اسی سلسلے میں انھوں نے بکثرت صوفیانہ اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں بلکہ اُن کے خالص "مجازی" تصورات بھی عشقِ حقیقی کی غمازی کرتے ہیں۔

فصلِ پنجم کے چھٹے باب میں قائم، میر سوز اور میر اثر کا ذکر ہے — یہ وہ شعراء ہیں جو باکمال ہونے کے باوجود، میر اور سودا کی وجہ سے زیادہ قبولِ عام حاصل نہ کر سکے۔ قائم تو درد کے اور پھر سودا کے شاگرد ہوئے۔ دہلی میں رہے۔ ملازمت کی، پھر ملازمت سے علاحدہ ہوئے تو اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ سودا سے کچھ عرصے تک بے تعلق ہوئے، پھر مل گئے اور اُن کی وفات تک اُن کے معتقد رہے۔ اُن کا بہت سا کلام جو سودا کے پاس رہ گیا تھا کلیاتِ سودا میں غلطی سے شامل ہو گیا۔ یہ تمام واقعات ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کی روشنی میں دیکھے ہیں اور اُن پر سے غلطیوں کی تاریکی کو دور کیا ہے۔ پھر ان کے کلیات اور تذکرے پر بحث کی ہے۔

ع۱ لیکن ڈاکٹر صاحب نے جلد دوم کے حصّہ اول (صفحہ ۴۰۱) میں المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کی تاویل دوسرے انداز سے کر دی ہے۔

قائم کو تذکرہ نگاری میں یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو تین طبقات میں تقسیم کرنے کی روایت قائم کی ہے جس کی پیروی دوسرے تذکرہ نگاروں نے کی ہے — ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ قائم کے تذکرہ "مخزنِ نکات" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جلوس عالمگیری کے چوالیسویں سال (یعنی ۱۱۱۲ھ میں) ولی دکنی، (اپنے دوست) سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی آئے تھے اور شاہ سعداللہ گلشن سے ملاقات بھی ہوئی تھی جنھوں نے ولی کو زبانِ ریختہ میں شعر کہنے کا مشورہ دیا تھا اور تعلیماً یہ مطلع موزوں کر کے ولی کے حوالے کیا تھا:-

"خوبیِ اعجازِ حسنِ یار اگر انشا کروں — بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں" (صفحہ ۷۷)ع۱

پھر ڈاکٹر صاحب نے دیوانِ قائم کے اشعار کی نوعیت قائم کی ہے کہ اس میں یا تو ایسے شعر ہیں کہ جن کا ایک ہی مصرع جان دار ہے، دوسرا نہیں — یا پھر دونوں مصرعے جاندار ہیں — یہ ایک لطیف تقسیم ہے جس سے شاید ہر شخص اتفاق نہ کر سکے گا۔ بہرحال، قائم کا مزاج میر یا مومن یا غالب جیسا تو نہیں ہے — خود سودا سے بھی مختلف ہے اور یہ اختلاف کب اور کس میں نہیں رہا ہے! ڈاکٹر صاحب نے خود بھی قائم کے اچھے اشعار نقل کیے ہیں (صفحہ ۸۳ تا ۸۵) جن سے کون متاثر نہ ہوگا!

قائم کی دوسری اصنافِ سخن اور اُن کے لسانی تجزیے کے بعد میر سوز کا ذکر آتا ہے — اُن کے حالات اور تصانیف کی تحقیق کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "سوز کی شاعری پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص مزے لے لے کر، کھلے بندوں اپنے عشق اور محبوب کی باتیں کر رہا ہے" (صفحہ ۹۸) ع۲

پھر خواجہ میر اثر کا ذکر ہے کہ "چھوٹا پیڑ بڑے پیڑ کے سایے میں دب کر رہ جاتا ہے" (صفحہ ۹۹)۔ قائم، سوز اور اثر اس دور میں "چھوٹے پیڑ" ہی تھے — اثر کی مثنوی نگاری پر بڑی تفصیلی بحث ہے کہ اس میں بہت سی خامیوں کے باوجود ایسی خوبیاں بھی ہیں جن سے اُن خامیوں کا احساس بھی نہیں ہوتا — اُن کی مثنوی "خواب و خیال" "تمام مثنویوں سے الگ ہے — اس کا طرز مثنوی کا سا ہے بھی اور اس سے مختلف بھی ہے۔ جدید دور میں اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایک شاعر کے عشق میں گم ہو جانے اور پھر تزکیے کے ذریعے ارتفاع حاصل کرنے کی داستان موجود ہے ... اس مثنوی کے طرزِ ادا نے جہاں میر درد کی روایتِ غزل کو آگے بڑھایا ہے وہاں غالب کی "کوئی امید بر نہیں آتی" والی غزلوں کے مزاج میں رنگ بھر کر اُسے (اوج) تک پہنچایا ہے۔ بغیر فارسی و عربی الفاظ کا یہ طرزِ ادا ہمارے اپنے دور کے لیے اندازِ بیان کی روایت کا حصہ ہے" (صفحہ ۱۰۸)ع۳

ع۱ ڈاکٹر صاحب نے پہلی جلد کے صفحات ۵۳۰ - ۵۳۶ میں ولی کے ایسے حالات درج کیے ہیں —

ع۲ "میر سوز — آثار و افکار" ایک عمدہ مقالہ سندھ یونیورسٹی میں سردار احمد صاحب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا تھا۔ افسوس کہ اب تک وہ شائع نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے سوز کی "ادا بندی" کی تحریک کا ذکر بھی کیا ہے (صفحہ ۹۷) یہ بھی معلومات میں ایک اضافہ ہے۔

ع۳ ڈاکٹر صاحب نے بہت خوب جائزہ لیا ہے — لیکن شاید میر تقی میر کے یہاں بھی سہل ممتنع کی روایت اسی انداز کی ہے:

جو مجھے دیکھنے کو آتا ہے — پھر مجھے دیکھنے نہیں آتا
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا — پر ہمارا نہ مدعا سمجھا

فصل پنجم کے ساتویں باب میں میر حسن کا ذکر ہے۔ اُن کے حالات کی تحقیق میں ڈاکٹر صاحب نے اُن کے دیوان کے دیباچے سے خان آرزو کے قیام لکھنؤ کا نکتہ دریافت کیا ہے اور پھر نتیجہ یہ نکالا ہے کہ خان آرزو قریب سترہ ماہ (۱۱۶۷ھ سے اپنی وفات ۱۱۶۹ھ تک) لکھنؤ میں تھے اور اسی زمانے میں یعنی ۱۱۶۸ھ میں میر حسن وہاں پہنچے تھے اس لئے میر حسن کی ولادت ۱۱۲۹ھ میں متعین کی جاسکتی ہے۔ اُن کی زندگی کے دوسرے مراحل کا بھی ذکر ہے اور اُن کی تصانیف کا بھی[1]۔ بالخصوص اُن کی مثنوی سحر البیان پر سیر حاصل بحث ہے اور فرمایا ہے کہ "(یہ مثنوی) ایک ایسا شاہکار ہے جس میں وہ ساری خصوصیات یکجا ہوگئی ہیں جو ایک بہترین مثنوی میں تصور کی جاسکتی ہیں۔ اس میں ایک طرف تو مثنوی کی روایتی ہیئت کو پورے طور پر برتا گیا ہے اور دوسری طرف اس میں قصہ پن کے ساتھ وہ ترتیب و ربط، قوتِ تخیل، شاعرانہ صفات، توازن و اختصار، تہذیب و معاشرت کی اثر انگیز تصویریں، منظر کشی و کردار نگاری، سلاست و روانی، زبان و بیان کا فنکارانہ استعمال بھی ہے کہ دو سو سال گزر جانے کے باوجود یہ آج بھی اُسی طرح دلچسپ، پُراثر اور تازہ ہے۔۔۔" (صفحہ ۱۸۵) — ۱۸

اسی فصل کے آٹھویں اور نویں ابواب میں جعفر علی حسرت، میر محمدی بیدار، شیخ قدرت اللہ قدرت، ہدایت اللہ ہدایت، ہیبت قلی خان حسرت، رکن الدین عشق، مرزا محمد علی فدوی، شیخ غلام علی راسخ، محمد روشن جوشش، اور شیر محمد خان ایمان کی شاعری اور اُن کے حالات کا جائزہ ہے۔ اور بہت سی نئی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

اس کے بعد فصل ششم شروع ہوتی ہے اور اس کے پہلے باب میں "اردو نثر" پر بحث آتی ہے۔ فرمایا ہے کہ "اس صدی میں (اٹھارہویں صدی میں) اردو تصنیف و تالیف (نثر میں) کا رُخ عوام کی طرف[2] تھا۔ وہی اس کے مخاطب تھے اور اُنھی کی زبان، اظہار کا وسیلہ تھی" (صفحہ ۴۹۸) — یہی کام صوفیہ نے ابتدائی اردو کے دور میں کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے موضوع کے لحاظ سے اس دور کی نثر کو (۱) تنقیدی اور علمی (۲) مذہبی (۳) تاریخی اور (۴) افسانوی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ان سب پر الگ الگ باب باندھا ہے۔

جعفر زٹلی کا ذریعۂ اظہار فارسی تھا لیکن الفاظ نے اردو کہاوتوں کو اپنے مخصوص ہجویہ اور مضحک انداز میں استعمال کیا تھا۔ سید برکت اللہ عشقی (م ۱۱۴۲ھ) نے عوارف ہندی میں (گو کہ وہ فارسی میں ہے) متعدد اردو امثال اور کہاوتوں کی صوفیانہ تشریح کی ہے۔ مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ) نے دہلی کی اصطلاحات اور وہاں کے فصحاء کا روزمرہ ایک فرہنگ کی صورت میں مرتب کیا اور گو کہ تشریح فارسی میں کی لیکن سند کے لیے زیادہ تر اردو اشعار اور کم تر فارسی اشعار درج کیے۔ سید عبدالولی عزلت (م ۱۱۸۹ھ) نے اپنے

۱۔ راقم الحروف کا ایک حقیر مضمون "میر حسن کی غزلیات" (ادبی جائزے) شاید مفید ثابت ہو سکے۔

۲۔ "نو طرز مرصع" ضرور عوام کے لیے نہیں تھی [illegible] یعنی نواب شجاع الدولہ کو پیش کی گئی تھی اس لیے اس میں عبارت آرائی اور انشاپردازی ہے۔ (صفحہ ۴۸۶)

۳۔ عزیزی ڈاکٹر نجم الاسلام کے پاس کلیات شائق کا عکس (قلمی) موجود ہے جس میں طپش کے انتقال کا قطعۂ تاریخ ہے۔ تاریخ کا شعر یہ ہے:

ناگاہ صدائے زد با دردِ دلِ گا ہاتف — حالا کہ برفت آہ مایۂ سخنِ اردو

دوسرے مصرع سے ۱۲۳۰ھ کے اعداد نکلتے ہیں لیکن "مایۂ سخنِ اردو" کی ترکیب غور طلب ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب ہی نے بیاضِ طپش والے مضمون میں (نقوش شمارہ ۱۰۸ ستمبر ۱۹۶۷ء) وقائع عبدالقادر خانی کی بنیاد پر یہ اطلاع دی ہے کہ طپش نے قید سے رہائی کے بعد راجہ نب کشن Nob Kissan کے متوسل بن کر کلکتہ میں قیام کیا۔ ڈاکٹر صاحب پچھلے دنوں کلکتہ گئے تھے تو وہاں سوبھا بازار میں اسی نب کشن (نبا کشنا) کے اخلاف کے قیام کا علم بھی ہوا۔ یہ "لب کشور" (صفحہ ۵۰۰) نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اور بھی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ بہار دانش میں لارڈ منٹو، ہارنگٹن، ٹیلر اور کالج کی مدح میں اشعار بعد کا اضافہ ہے۔ یہ مثنوی انھوں نے قید کی حالت میں لکھی تھی اور وہ اُس وقت انگریزوں سے بغاوت کے جرم میں سزا بھگت رہے تھے۔ کالج سے اُن کا تعلق، ملازمت کا نہیں تھا۔ کلیات کا چھپنا بھی ثبوت طلب ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس کا ایک نسخہ کالج کے کتب خانے میں داخل ہوا تھا۔ طپش نے مرشد آباد ہی میں شمس البیان لکھی تھی۔ اس میں مصطلحات اور محاورات کی تعداد ۲۹۰ ہی نہیں ہے بلکہ ذخیرۂ شادانی کے مطبوعہ اور کلیات کے قلمی نسخوں میں تعداد مختلف ہے اور یہ کہ شمس البیان کے دیباچے کی عبارت اردو میں درج ہے تو یہ صراحت کہیں نہیں ہے کہ وہ دیباچہ طپش نے پہلے فارسی میں لکھا تھا اور اب اُس کا ترجمہ اردو میں دیا جا رہا ہے —

اردو دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا جس میں فارسی کا اثر ضرور ہے لیکن اردو مزاج نمایاں ہے۔ مرزا علی نقی خاں الطاف حیدر آبادی (م ۱۱۹۵ھ) نے اپنے رسائل کے مجموعے پر اردو نثر میں دیباچہ لکھا لیکن اس میں اسما اور افعال کے علاوہ، جملے کے جملے فارسی ساخت ہی کے ہیں۔ مرزا رفیع سودا (م ۱۱۹۵ھ) کی مثنوی "سبیل ہدایت" کا دیباچہ اردو نثر میں ہے لیکن زمانے کے رواج کے مطابق اس میں عبارت آرائی ہے۔ محمد باقر آگاہ ویلوری (م ۱۱۵۸ھ) نے اپنی کئی تصانیف کے دیباچے اردو میں لکھے۔ ان میں دکنی لب ولہجہ ضرور ہے لیکن زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ انھوں نے اپنے اردو دیوان کے دیباچے میں[1] اقسام سخن پر بحث کرنے کے بعد "ریختہ گویوں" کو بعض علمی مشورے بھی دیے ہیں جن سے اُن کے فنی اور تنقیدی شعور کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ان کے کچھ بعد جب غلام علی عشرت بریلوی (م ۱۲۳۶ھ) نے پدماوت (اردو منظوم) کا دیباچہ لکھا تو شمالی ہند میں ہونے کی وجہ سے فارسی عبارت آرائی کو ترجیح دی، گویا ان کی اردو بالکل فارسی اسلوب میں ہے اور تھوڑی سی بات بڑی بڑی عبارتوں میں چھپ گئی ہے۔

پھر اس فصل کا تیسرا باب شروع ہوتا ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی مذہبی تصانیف سے متعلق ہے۔ ص 19
اور اسی سلسلے میں فضلی کی کربل کتھا پر بحث کی ہے اور اس کے ماخذ مُلا حسین واعظ کاشفی (م ۹۱۰ھ) کی روضۃ الشہداء کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسے اٹھارھویں صدی عیسوی کے کئی شعراء نے نظم کیا تھا[2]۔
ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ کریم الدین نے اپنے تذکرے میں کربل کتھا کے طویل اقتباسات درج کیے ہیں۔ اسی وجہ سے پہلی بار اس کتاب کا اور اس کے مصنف فضلی کا علم ہوا ہے اور گارساں دتاسی کو بھی کریم الدین کے ذریعے معلومات حاصل ہوئی ہیں[3]۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ملا واعظ کاشفی کی روضۃ الشہداء میں دس باب ہیں اور ایک خاتمہ ہے۔ لیکن کربل کتھا میں فضلی کے دیباچے اور مقدمے کے علاوہ فاتحات بھی شامل ہیں جو اردو نثر میں ہیں۔ دیباچہ اور مقدمہ تو خود فضلی کا ہے۔ لیکن فاتحات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا یہ بھی اس فارسی خلاصے میں شامل تھے جس سے فضلی نے ترجمہ کیا ہے۔ یا یہ خود فضلی کا اضافہ ہیں" (صفحہ ۱۰۳۲)۔

ڈاکٹر صاحب نے اس ترجمے میں برصغیر کے عمومی ماحول کی نشان دہی بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

کربل کتھا کا موضوع تو واقعات کربلا ہیں۔ لیکن پوری کتاب کا عمومی ماحول خالص برعظیم (یا برصغیر!) کا ماحول ہے۔ شادی بیاہ، رسم و رواج، آداب محفل، لباس و زیور، رہن سہن، کھانا پینا اور نشست و برخاست کے طور طریقے وہی ہیں جو برعظیم (برصغیر) کے ساتھ مخصوص ہیں۔ (صفحہ ۱۰۳۵)۔ ڈاکٹر صاحب نے اس عمومی ماحول کی نشان دہی ایک دو جگہ سے کی ہے اگر پوری کتاب سے اس عمومی ماحول کو یکجا کرایا جائے تو اُس صدی کے معاشرے کے متعلق بہت سی مفید معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔ اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کو بہت کچھ سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کی لسانی خصوصیات بھی بیان کی ہیں اور شمال و جنوب کی ایسی خصوصیات کی مماثلت بھی

ع ۱ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس دیباچے میں محمد باقر آگاہ نے اپنے معاصر شعراء کا ذکر کیا ہے لیکن میر کا ذکر نہیں ہے (صفحہ ۱۰۱۰)۔

ع ۲ علیم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں کئی دکنی شعراء کی روضۃ الشہداء نام کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ راقم الحروف نے جنوری ۱۹۴۰ء کے رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں ولی ویلوری کی روضۃ الشہداء کی تفصیل بیان کی تھی کہ وہ ۱۱۵۱ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ مکرمی لطیف الزماں صاحب نے بھی ایک دکنی شاعر کی قلمی روضۃ الشہداء مجھے عنایت کی تھی (شاعر کا نام اب یاد نہیں)۔ وہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم نے مجھ سے مطالعے کے لیے لی تھی لیکن اُن کا انتقال ہو جانے سے وہ انھی کے گھر رہ گئی۔

ع ۳ فضلی کی کربل کتھا پر تحقیقی مضمون ڈاکٹر نجم الاسلام نے نقوش (جولائی ۱۹۷۳ء) میں شائع کیا تھا۔ گارساں دتاسی (بلکہ غوث محی الدین دتاسی جیسا کہ خود اس نے اپنے مرتب کردہ دیوان ولی میں اپنا اسلامی نام لکھا ہے) نے اپنی تاریخ کے دوسرے ایڈیشن میں کریم الدین کے تذکرے سے مصنف کے متعلق تفصیلات حاصل کی ہوں گی۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا تو اُس میں ۱۸۵۰ء میں چھپنے والی دہ مجلس کے اقتباسات کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ دہ مجلس کسی اور کی ہو فضلی کی نہ ہو۔

بتائی ہے۔ شری کی تقلید میں زیر، زبر اور پیش کے بجائے جو ی، الف اور واو کا استعمال عام تھا اس کا ذکر بھی آیا ہے عـ۱
اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شاہ معین الدین حسین علی (م ۱۱۹۹ھ) کی فتوح المعین عـ۲ کی کتاب کی تفصیل دی ہے کہ وہ
تصوف سے متعلق "جامِ جہان نما" کا آزاد ترجمہ ہے اور اُس میں اردو (!) اصطلاحاتِ تصوف (صفحہ ۱۰۴۲) ہیں
پھر تصوف اور دین کے رشتے سے شاہ مراد اللہ کی تفسیرِ مرادیہ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ صرف تیسویں پارے کی تفسیر
ہے اور اس کا تاریخی نام "خدائی نعمت" (۱۱۸۵ھ) ہے عـ۳ اور اس میں عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہے اسی لیے زیادہ
مقبول ہوئی۔ پھر شاہ رفیع الدینؒ عـ۴ (م ۱۲۳۳ھ) کے اردو ترجمۂ قرآن پاک اور تفسیرِ رفیعی کا ذکر ہے اور ان کی نثری
خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ (م ۱۲۳۰ھ) حضرت شاہ ولی اللہؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے تیسرے فرزند تھے۔
انھوں نے اپنے بھائی شاہ رفیع الدینؒ کے تحت اللفظ ترجمے کے بعد یہ ضرورت سمجھی کہ "ترکیبِ ہندی" کے مطابق
قرآن پاک کا وضاحتی ترجمہ کیا جائے جو مختصر تفسیر بھی ہو۔ موضحِ قرآن اس تفسیر کا تاریخی نام ہے یعنی یہ ۱۲۰۵ھ میں
مکمل ہوئی عـ۵ ڈاکٹر صاحب نے اس تفسیر میں سے بہت سے محاورات جمع کیے ہیں (صفحہ ۱۰۵۹-۱۰۶۰) — اسی کے ساتھ حکیم
محمد شریف خان (م ۱۲۱۶ھ) کے ترجمۂ قرآن پاک کا ذکر ہے جس کا ایک اقتباس مولانا احسن مارہروی مرحوم کی
"نمونۂ منثورات" میں سب سے پہلی بار درج ہوا تھا (اس ترجمے پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے)۔

پھر عیسائی مبلغین کی بعض مساعی کا ذکر ہے کہ انھوں نے سترھویں صدی عیسوی کے اوائل سے کس طرح برِصغیر کو قریب سے
دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یہاں کی لغت اور صرف و نحو پر بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ سب اسی تبلیغی سلسلے کی
وجہ سے ہے۔

ہندو مت پر بھی اسی زمانے میں لکھا جانے لگا۔ مول رام نے ۱۱۹۵ھ میں بھگوت گیتا کی دانش و حکمت کی باتیں اردو میں
لکھیں۔ پروفیسر محمد سلیم صاحب نے سب سے پہلے اس مخطوطے کا ذکر کرکے اس کی خصوصیات بتائی تھیں۔ ہندی اور سنسکرت
الفاظ کی کثرت سے اس کا مفہوم کم سمجھ میں آتا ہے اور یہی خصوصیت ہندو مت کی بہت سی دوسری کتابوں کی ہے جو
نول کشور پریس سے شائع ہوئی ہیں اور اردو رسم الخط میں ہیں عـ۶ گو کہ بعد میں شائع ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اس فصل کا آخری باب آتا ہے جو افسانوی تصانیف سے متعلق ہے۔ تمہید میں عام داستانوں اور افسانوں کے پلاٹ کی
خصوصیات بیان کی ہیں اور نواب عیسوی خان کی داستان "قصۂ مہر افروز و دلبر" سے بات شروع کی ہے۔ پہلے
اس مصنف کے حالات کی تحقیق کی ہے۔ پھر اس قصے کی تفصیل دی ہے۔ کرداروں کے نام عام طور پر علامتی ہیں (جیسے
سب رس میں ہیں) اور اس میں جزئیات بھی اسی پسند کے مطابق ہیں۔ زبان پر بھی بحث کی گئی ہے تاکہ اس کے زمانے کی
شناخت ہو سکے۔

عـ۱ ایسا استعمال اب بھی بعض بزرگوں کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۱۰۴۰) لکھا ہے کہ بعض کتابوں میں ستہ (ستو کے
عدد کے لیے) استعمال ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تاریخ کا مادّہ "اٹھارہ سے بچھتّر" بھی تاریخ بن گیا ہے۔
عـ۲ صفحہ ۱۰۴۱ میں اس کا نام فتوح المعین ہے۔ لیکن صفحہ ۱۰۴۲ میں دو جگہ اور حاشیہ نمبر ۱۸ میں فتح المعین چھپ گیا ہے۔
عـ۳ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ شاہ مراد اللہ سنبھل ضلع مراد آباد کے محلہ میاں سرائے کے رہنے والے تھے (صفحہ ۱۰۴۴) — یہ قیاس ہوگا، کیونکہ اس جگہ
نواب امین الدولہ رہتے تھے۔ شاہ مراد اللہ تو اپنا وطن ترک کرکے بنگال چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے ایم اے کے مقالے میں (۱۹۶۰ء) پھر
پی ایچ ڈی کے مقالے میں اور "تین نثری نوادر" میں شاہ مراد اللہ کی تفسیر پر تفصیل سے بحث کی تھی۔ اور اسی میں اس کے غیر مطبوعہ دیباچے کا پہلی بار ذکر
کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد مسعود صاحب نے اپنے مقالے "اردو میں قرآنی تراجم و تفاسیر" میں بھی بہت سی اہم چیزیں درج کی ہیں۔ راقم الحروف کا مقدمۂ وحی منظوم
(سیماب اکبر آبادی) بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ عـ۴ شاہ رفیع الدینؒ کی تصانیف کی تفصیل پروفیسر محمد شفیع مرحوم کے مقالات جلد چہارم میں ہے۔
عـ۵ ڈاکٹر نجم الاسلام کے مقالہ "دبستانِ دہلی کا نثر" میں موضح قرآن پر تفصیلی بحث ہے۔
عـ۶ مثلاً جوگ بسشٹھ (دوسری جلد) اس طرح شروع ہوتی ہے۔ بالمیک جی کہتے ہیں کہ جب بھاردواج الیتم پر کرن کے جواب تم شہیان
پر کرن سنو جس کے جاننے سے تم نروان پد کو پراپت ہوگے۔ بڑے اتم بچن منیشور نے سری رام چندر جی سے کہے ہیں ۔۔۔

اسی دور سے متعلق تحسین کی نوطرزِ مرصع بھی ہے۔ اس کے قصوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "تحسین نے نواب شجاع الدولہ کی وفات سے پہلے نوطرزِ مرصع کا ایک قصہ لکھا تھا جس کا ثبوت اُن مخطوطات سے بھی ملتا ہے جن میں صرف پہلے درویش کی داستان ملتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان مخطوطات کے بعد ہماری نظر وقائع عبدالقادر خانی پر پڑتی ہے جس میں تحسین کا ذکر دو جگہ آیا ہے" (صفحہ ۱۰۹۶) ؏۱

ڈاکٹر صاحب نے دوسرے قصوں کا ذکر بھی کیا ہے جو نوطرزِ مرصع سے متاثر ہوئے ہیں۔ پھر اس کے اسالیب کا ذکر ہے اور جیسے ان کے "مزاج" میں فرق ہے (صفحہ ۱۱۰۷) تو ظاہر ہے کہ قلم میں بھی فرق پیدا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ دور وہ ہے کہ برِعظیم (برِصغیر؟) پر انگریزوں کی حکم رانی کم و بیش قائم ہو چکی ہے۔ بادشاہ، نام کا بادشاہ رہ گیا ہے اور اُس کی بادشاہت، کمپنی بہادر کی محتاج ہے۔ ہمارا روایتی طرزِ احساس اس نئے تصورِ حقیقت کے پھیلنے کے ساتھ دم توڑ رہا ہے۔ تحسین اس روایتی اسلوب کا دامن تھامنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نوطرزِ مرصع گواہ ہے کہ یہ دامن اُن کے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے ۔ ۔ ۔" (صفحہ ۱۱۰۸)۔ اس کے بعد مہر چند مہر، شاہ عالم ثانی اور شاہ حسین حقیقت کے قصوں کا ذکر ہے اور ان پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور آخر میں ایک اجمالی جائزہ ہے کہ :- ۲۱

"اردو نثر جس کا مطالعہ ہم نے پچھلے صفحات میں کیا ہے، فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے لکھی گئی ہے۔ پہلے اردو نثر کا عام رجحان مرصع و مسجع انشا پردازی کی طرف تھا، پھر رفتہ رفتہ سادگی کی طرف ہو گیا۔ نوطرزِ مرصع کے مخاطب خواص تھے۔ لیکن تفسیر مرادیہ کے مخاطب عوام تھے۔ موضح قرآن اور عجائب القصص کے مخاطب عوام و خواص دونوں تھے، اس لیے ان کی نثر عام فہم، سادہ اور بول چال کی زبان سے قریب ہے۔ عام زبان میں نثر لکھنے کا یہ رجحان اٹھارویں (اٹھارہویں) صدی میں آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے اور انیسویں صدی میں عام رجحان بن جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی پرانے رجحانات کے دم توڑنے اور نئے رجحانات کی پیدائش کی صدی ہے۔ جو کچھ اُس صدی میں ہوا اُس کی واضح صورت انیسویں صدی میں نظر آتی ہے۔ حال کا ماضی سے اور مستقبل کا حال سے یہی رشتہ ہے اور اسی رشتے سے زندگی کا تسلسل قائم ہے" ۔ تمت بالخیر

؏۱ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے رسالہ صحیفہ (لاہور۔ اپریل ۱۹۶۸ء) میں گربہ نامہ کے سلسلے میں وقائع عبدالقادر خانی کے ان دو مقامات کا ذکر کیا تھا جہاں تحسین کا ذکر آتا ہے بطور حاشیہ میں لکھا ہے کہ "مولوی عبدالقادر رام پوری، جن کے وقائع کا ترجمہ علم و عمل کے نام سے چھپ چکا ہے، نہ صرف علی الدین خان مراد آبادی اور اُن کے خاندان سے بخوبی واقف تھے بلکہ منشی مشرف علی خان پسرِ تحسین سے بھی واقف تھے۔ مراد آباد میں مولوی عبدالقادر رام پوری کی سسرال تھی اور وہ اپنی عملی زندگی کے ابتدائی دور میں مراد آباد میں رہتے تھے۔ اسی قیام مراد آباد کے دوران میں انہیں منشی مشرف علی پسرِ تحسین سے بھی واسطہ پڑا تھا، جو اُس زمانے میں کمشنری بورڈ متعلقہ علاقہ مراد آباد کے انگریز حاکم کے منشی تھے۔ اسی ذاتی واقفیت کی بناء پر مولوی عبدالقادر رام پوری کا انکشاف درست ہونا چاہیے۔ اور یہ جو مولوی عبدالقادر رام پوری نے لکھا ہے کہ چہار درویش میں سب منشور کلام علی الدین خان مراد آبادی کا ہے، تو اس سے شاید یہ مراد ہو کہ باقی ماندہ حصہ لکھنے کے علاوہ علی الدین خان نے تحسین کی لکھی ہوئی داستانِ اول پر بھی نظرِ ثانی کی اور غالباً دینی تقشف کی بناء پر علی الدین خان نے قصے کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہ کیا۔"

(تاریخ ادب اردو جلد اول و دوم مؤلفہ ڈاکٹر جمیل جالبی پر

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا غیر مطبوعہ مقالہ)